اُسوۂ رسول ﷺ

کی روشنی میں

ہماری دینی ذمہ داریاں

احمدہ واُصلی علی رسولہ الکریم ـــــــ اما بعد

اعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم   بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا﴾ (الاحزاب: ۲۱) صدق اللّٰہ العظیم

رب اشرح لی صدری ویسرلی امری واحلل عقدۃ من لسانی یفقھوا قولی!

سورۃ الاحزاب کے تیسرے رکوع کے درس کی تکمیل کے بعد میں چاہتا ہوں کہ اس نشست میں آپ نبی اکرم ﷺ کے ''اسوۂ حسنہ'' کے بارے میں چند اور باتیں سلسلہ وار ایک' دو' تین کی طرح نوٹ کرلیں اور اپنے ذہن میں بٹھالیں۔

نبی اکرم ﷺ کی اجتماعی جدوجہد کی نوعیت

میں دورانِ درس یہ عرض کر چکا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ مطہرہ اور حیات طیبہ ہر ایک اعتبار سے اسوہ ہے۔ ''اسوہ'' کا اصل مفہوم اتباع اور پیروی ہے۔ لیکن سورۃ الاحزاب کے درس کے دوران آنحضور ﷺ کا جو اُسوہ ہمارے سامنے آتا ہے' اس کو پیشِ نظر رکھئے اور پہلے ایک سوال کا جواب آپ خود اپنے طور پر دینے کی

کوشش کیجئے کہ آنحضور ﷺ کی جو اجتماعی جدوجہد ہے' وہ کیا ہے؟

آنحضور ﷺ کے بعض کام خالص انفرادی ہیں اور وہ ایسے بھی ہیں کہ ہم ان کا اتباع نہیں کر سکتے ـــــ مثلاً نبی اکرم ﷺ صومِ وصال رکھتے تھے۔ یعنی آپؐ بغیر افطار کے ایک کے بعد دوسرا' پھر تیسرا روزہ' بلکہ اس سے بھی زیادہ رکھا کرتے تھے' لیکن آپؐ نے اُمت کو اس سے روک دیا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے پوچھا بھی کہ آپؐ ہمیں کیوں منع فرماتے ہیں؟ ـــــ جواب میں ارشاد ہوا: ((وَاَيُّكُمْ مِثْلِيْ؟)) ''تم میں سے کون ہے جو مجھ جیسا ہو؟'' ((اِنِّيْ اَبِيْتُ يُطْعِمُنِيْ رَبِّيْ وَيَسْقِيْنِيْ)) (متفق علیہ) ''میں تو اس حال میں رات بسر کرتا ہوں کہ میرا ربّ مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے''۔ معلوم ہوا کہ آنحضور ﷺ کی انفرادی زندگی کے بعض پہلو ایسے ہو سکتے ہیں جن کے لئے ہم اتباع کے مکلّف نہیں ہیں ـــــ وہ خصوصیات ہیں جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی ـــــ حضورؐ فرماتے ہیں کہ میں اپنی پشت کی طرف سے بھی دیکھتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ ہمارے لئے یہ ناممکن ہے۔ اس اعتبار سے اوّلیت جس اسوہ کو حاصل ہے' وہ اُسوہ آپ کی اجتماعی زندگی کا نقشہ ہے۔ اس کا ہر ہر قدم واجب الاتباع ہے۔ اسی اعتبار سے یہ فرمایا گیا ہے کہ: ﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ ـــــ اس لئے میں یہ کہہ رہا ہوں کہ آپ ذرا اپنے ذہن میں یہ سوال لایئے کہ نبی اکرم ﷺ کی جو اجتماعی جدوجہد ہے' وہ کس نوعیت کے کام سے زیادہ مشابہت رکھتی ہے! مثلاً ایک نوعیت ہوتی ہے رفاہِ عامہ کے کاموں کی ـــــ لوگ یہ کام کرتے ہیں۔ پھر خدمتِ خلق کے بے شمار میدان ہیں' جن کے لئے انجمنیں بنتی ہیں' ادارے وجود میں آتے ہیں۔

دوسرے کچھ محدود پیمانے کے تبلیغی کام ہوتے ہیں۔ دنیا میں بے شمار مشنریز (Missionaries) ہیں جو تبلیغ کے کام میں مصروف ہیں۔ یہودیوں کی تبلیغ ہے' عیسائیوں کی تبلیغ ہے۔ بدھ مت کے بھکشو ہیں جو تبلیغ کرتے ہیں۔ آریہ سماجی بھی یہ کام کرتے ہیں۔ یہ بھی ایک اجتماعی نوعیت کا کام ہے۔ یہ وہ تبلیغ ہے جس میں تلوار کبھی ہاتھ میں نظر نہیں آئے گی ـــــ اس تبلیغ کا معاملہ کبھی جہاد وقتال تک نہیں جائے گا۔ وہ ساری

عمر تبلیغ ہی رہے گی اور نسلاً بعد نسلٍ یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔

ذہن میں تیسرا خانہ بنایئے تعلیمی اور تحقیقی کام کا___ اس کے لئے بھی انجمنیں بنتی ہیں' ادارے بنتے ہیں___ تعلیم کو عام کرنے کی عملی تدابیر اختیار کی جاتی ہیں۔ مکتب' اسکول' کالج اور یونیورسٹیاں قائم ہوتی ہیں۔ ریسرچ کے لئے ادارے اور فاؤنڈیشنز قائم ہوتی ہیں جن کے تحت یہ کام ہوتا ہے۔ کسی خاص فکر کو پھیلانے اور promote کرنے کے لئے اکیڈمیاں بنتی ہیں' جیسے ''اقبال اکیڈمی'' جو ڈاکٹر اقبال مرحوم کے فکر کو پھیلانے کے کام میں مصروف ہے۔ سقراط نے بھی ایک اکیڈمی بنائی تھی' جس میں وہ اپنے فکر کے مطابق کچھ ذہین لوگوں کو تیار کرتا تھا۔

چوتھا کام سیاسی نوعیت کا ہوتا ہے۔ اس کے لئے بھی جماعتیں' جمعیتیں اور پارٹیاں بنتی ہیں' تحریکیں اٹھتی ہیں' سیاسی میدان میں کام ہوتا ہے' الیکشن ہوتے ہیں۔ اس سیاسی کام کی اصل نوعیت عموماً یہ ہوتی ہے کہ جس جگہ جو نظام قائم ہوتا ہے اصولی اعتبار سے اُس سے اختلاف نہیں ہوتا۔ صرف تفصیلات میں اور انتظامی اعتبارات سے ایک جماعت کا منشور (Manifesto) کچھ اور ہوتا ہے اور دوسری جماعت کا کچھ اور۔ مثلاً امریکہ میں ڈیموکریٹس اور ری پبلکن پارٹیاں ہیں' انگلینڈ میں لیبر پارٹی' کنزرویٹو پارٹی اور لبرل پارٹی ہے' تو امریکہ یا انگلستان میں جو بنیادی دستور موجود ہے اور جو نظام رائج ہے یعنی جمہوریت کا نظام' وہ سب پارٹیوں کے نزدیک متفق علیہ ہوتا ہے۔ لیکن تفصیلات میں جا کر چند پالیسیوں کے بارے میں اختلافات ہوتے ہیں اور اس ضمن میں پارٹیوں کے منشور اختلافات کے حامل ہوتے ہیں۔ ہر پارٹی اس اعلان کے ساتھ الیکشن کے میدان میں اترتی ہے کہ اگر ہمیں زیادہ ووٹ ملیں گے اور اقتدار ہمارے ہاتھ میں آ جائے گا تو ہم یہ اور یہ کام کریں گے جس سے ملک اور عوام کو فائدہ پہنچے گا۔ یہ ہوتی ہے سیاسی کام کی حقیقی نوعیت۔

اسی طرح کئی دیگر نوعیتوں کے کام بھی ہو سکتے ہیں' لیکن آپ ان چار انواع کے کاموں کو ذہن میں رکھ کر اب پانچویں نوعیت کے کام پر غور کیجئے' اور وہ ہے انقلابی کام___ انقلاب یہ ہوتا ہے کہ کسی جگہ پر جو نظام قائم ہے اس کو جڑ سے اکھیڑنا ہے' بنیادی تبدیلی لانی ہے اور پورے نقشے کو بدلنا ہے۔

گفت رومی ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند
تو می دانی اوّل آں بنیاد را ویراں کنند!

یہ انقلابی کام اُس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ رائج الوقت نظام کو جڑ اور بنیاد سے اکھیڑ کر اس کی جگہ دوسرا نظام نہ لایا جائے۔

اب ان پانچ انواع کے کاموں کو ذہن میں بٹھا لیجئے: ۱۔ رفاہی کام' ۲۔ تبلیغی کام' ۳۔ تعلیمی' علمی اور تحقیقی کام' ۴۔ سیاسی کام' اور ۵۔ انقلابی کام___ ان میں سے ہر ایک کے اپنے تقاضے اور اپنی connotations ہیں۔ چنانچہ ہر ایک کا نقشہ جدا بنے گا' ہر ایک کے لوازم جدا ہوں گے۔

اب آپ میرے اس سوال کا جواب دیجئے کہ نبی اکرم ﷺ کا اسوۂ حسنہ ان پانچ کاموں میں سے کس کام سے مشابہت رکھتا ہے؟

کیا اس میں کوئی شک ہے کہ وہ انقلابی کام ہے؟ یعنی نظام کی تبدیلی اور وہ بھی جزوی نہیں' بلکہ پورے نظام کی تبدیلی۔ وہ صرف تبلیغی کام نہیں تھا' صرف علمی کام نہیں تھا' صرف سیاسی کام نہیں تھا' صرف رفاہی کام نہیں تھا___ بلکہ اجتماعی پیمانے پر رفاہی کام تو ہمیں نبی اکرم ﷺ کی انقلابی جدوجہد کے درمیان نظر ہی نہیں آتے۔ نبی اکرم ﷺ کی زندگی میں اجرائے وحی سے قبل بالکل انفرادی سطح پر خدمتِ خلق اور رفاہِ عامہ کا کام اپنے پورے عروج پر نظر آتا ہے' لیکن نبوت و رسالت کے منصب پر سرفراز ہونے کے بعد حضور ﷺ کی پوری زندگی ایک انقلابی جدوجہد کا نقشہ پیش کرتی ہے___ جزوی نہیں' بلکہ مکمل انقلابی جدوجہد___ گویا ع

نظامِ کہنہ کے پاسبانو! یہ معرضِ انقلاب میں ہے!

سیرت النبی ﷺ کے موضوع پر اپنی متعدد تقاریر میں مَیں اس انقلابی جدوجہد کے نقشے کو اپنی امکانی حد تک بڑی تفصیل سے بیان کر چکا ہوں۔ اس موقع پر میں چاہوں گا

کہ اختصار کے ساتھ اس جدوجہد کے اہم خصائص اور اصول ومبادی آپ کے سامنے اس طرح پیش کروں کہ آپ ان کو ترتیب وار ذہن نشین کر لیں۔

آنحضور ﷺ کی انقلابی جدوجہد کے مراحل

اس انقلابی جدوجہد کے ضمن میں آپ کو سیرتِ مطہرہ میں سب سے اوّل اور نمایاں چیز یہ نظر آئے گی کہ یہ ساری جدوجہد خالص انسانی سطح (Human Level) پر کی گئی ہے۔ کسی بھی انقلاب میں جو مراحل آتے ہیں، وہ سب کے سب انقلاب محمدیؐ میں بھی آئے —— ہر انقلابی دعوت کو تین مراحل سے لازماً سابقہ پیش آتا ہے:

پہلا مرحلہ ہے ''دعوت وتربیت''۔ خالص دینی اصطلاحات کے اعتبار سے یہ بات اس طرح کہی جائے گی کہ ''دعوتِ ایمان اور تزکیہ''۔ یعنی لوگوں کو اللہ کی آیات سنانا اور قبول کرنے والوں کا تزکیہ کرنا۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿یَتۡلُوۡا عَلَیۡکُمۡ اٰیٰتِنَا وَیُزَکِّیۡکُمۡ﴾ (البقرۃ:۱۵۱) عام دُنیوی لحاظ سے اس کی تشریح یوں ہوگی کہ کوئی انقلابی فکر، کوئی نظریہ، کوئی فلسفہ اور کوئی نقطۂ نظر ہوگا، اس کو پہلے پھیلایا جائے گا۔ جو اس دعوت کو قبول کریں گے تو اس دعوت کے اعتبار سے پھر ان کی تربیت کی جائے گی۔ بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیر بے زنہار تو!

پختہ ہوئے بغیر کام نہیں چلے گا۔ البتہ واضح رہے کہ انقلابی کارکنوں کی تربیت دعوت کے لحاظ سے ہوگی —— مثلاً جو لوگ کمیونزم کے نظریئے کو قبول کر لیں گے، ان کی تربیت کے لئے کوئی اور نظام ہوگا —— اس میں یہ نہیں ہوگا کہ نماز پڑھو، روزہ رکھو، زکوٰۃ ادا کرو، حج کرو اور اپنے تمام معاملات کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیمات واحکام کے تابع رکھو۔ نہ اس میں یہ ہوگا کہ اپنی نظر اور دل کو پاک صاف رکھو۔ کھلی آزادی ہوگی کہ جس طرح چاہو اپنی تسکینِ ہوس کا سامان کرلو۔ جاؤ عیش کرو، شادی کا کیا سوال ہے، اس کے بغیر بھی جنسی ضرورت کو کامریڈ مرد اور کامریڈ عورتیں مل جل کر پوری کریں۔ ان کی تربیت میں طبقاتی نفرت وعداوت پیدا کی جائے گی۔ مزدور اور سرمایہ دار کا امتیاز اجاگر کر کے ان کو آپس میں لڑانے کی سبیل پیدا کی جائے گی۔ ان کو تخریب کاری کی ٹریننگ دی جائے گی۔ تربیت کا نظام ہر انقلابی دعوت میں ہوتا ہے لیکن اس کا حدود اربعہ مختلف ہوتا ہے، اس کے صغریٰ کبریٰ اور متعلقات جدا ہوتے ہیں۔ وہ اس نقطۂ نظر کے مطابق ہوں گے کہ اصل کام کیا کرنا ہے اور کون سا انقلاب لانا پیش نظر ہے۔ سوشلسٹ انقلاب برپا کرنا ہے تو اس کی تربیت کی نوعیت وہ گی جس کا میں نے ابھی ذکر کیا۔ اسلامی انقلاب لانا ہے تو اس کی تربیت کی نوعیت دوسرے انقلابات کی تربیت کے معاملے میں بالکل جداگانہ نوعیت کی ہوگی۔ اس میں اللہ پر، توحید کے التزام اور شرک سے اجتناب کے ساتھ، ایمان لانا ہوگا۔ اس میں یوم آخرت پر، اس کی کل جزئیات کے ساتھ، ایمان لانا ہوگا۔ اس میں رسالت پر، اطاعت ومحبت کلی کے ساتھ، ایمان لانا ہوگا —— بہرحال ''دعوت اور تربیت'' ان دونوں الفاظ کو ایک جوڑے کی حیثیت سے بریکٹ کر لیجئے۔ نبی اکرم ﷺ نے بھی یہ دونوں کام کئے اور بھرپور طریقے پر کئے۔

دوسرا مرحلہ ہے ''تنظیم'' —— اور اسی کے ساتھ جڑا ہوا لفظ ہے ''ہجرت'' —— یعنی آپس میں جڑو اور دوسروں سے کٹو۔ اگر کسی سے کٹو گے تو کسی سے جڑو گے بھی —— جناب محمد رسول اللہ ﷺ سے جڑو گے تو ظاہر ہے کہ اپنے گھر والوں سے کٹو گے۔ سیدھی سادھی بات ہے، اس میں کوئی الجھاؤ نہیں۔ یہاں یہ نہیں ہوسکتا ہے کہ دونوں رشتے ساتھ چل سکیں۔ یہاں credit ہوگا تو debit بھی ہوگا۔ اگر کسی سے کٹنے کو تیار نہیں تو پھر کسی اور سے جڑ بھی نہیں سکتے۔ چنانچہ آپ ان دو الفاظ ''تنظیم'' اور ''ہجرت'' کو اپنے ذہن میں یکجا کر لیجئے۔

تیسرا مرحلہ ہے جہاد اور قتال —— جہاد کو میں یہاں Passive Resistance کے معنی میں لے رہا ہوں۔ جدوجہد ہے، دعوت وتبلیغ ہے، مشرکانہ عقائد پر تنقید ہے۔ اس کے ردّعمل میں مشرکین کی طرف سے جور وستم ہے، ایذا رسانی

ہے' تعدّی ہے' مصائب ہیں ـــــ لیکن ابھی ہاتھ نہیں اٹھ رہا۔ حکم ہے کہ ماریں کھاؤ مگر
مدافعت میں بھی اپنا ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ تمہیں دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹا دیا جائے تو بھی
برداشت کرو اور جھیلو۔ تمہیں تپتی ہوئی زمین پر اس حال میں لٹا دیا جائے کہ اوپر سے مکہ
جیسے گرم علاقے کا سورج آگ برسا رہا ہو' پھر تمہارے سینے پر پتھر کی سل رکھ دی جائے'
تمہاری ٹانگوں میں رسی باندھ کر کھینچا جائے' تو بھی جھیلو اور برداشت کرو' retaliate
نہیں کر سکتے۔ میں کئی بار عرض کر چکا ہوں کہ ایسے حالات میں اگر آدمی desperate
ہو جائے' اپنی جان سے ناامید ہو کر مشتعل ہو جائے تو ایک آدمی دس کو مار کر مرے گا۔
لیکن نہیں! ـــــ کیا حضرت یاسر ؓ کسی کو نہ مار سکتے تھے جب ان کی نگاہوں کے
سامنے ان کی اہلیہ محترمہ سمیہ (رضی اللہ عنہا) کو ابوجہل نے اس طرح برچھی ماری کہ
پشت کے پار ہو گئی! پھر وہ خود یعنی حضرت یاسر ؓ کس طرح مظلومانہ اور بہیمانہ طور پر
شہید ہو گئے' لیکن اُف تک نہ کی ـــــ اس لئے کہ ایمان لانے کی وجہ سے اس خاندان
پر ظلم وستم کے پہاڑ بہت پہلے سے توڑے جا رہے تھے اور جب کسی ایسے موقع پر نبی
اکرم ﷺ کا گزر ہوتا تو آپؐ فرماتے: اِصۡبِرُوۡا یَا آلَ یَاسِرَ فَاِنَّ مَوۡعِدَکُمُ الۡجَنَّۃُ
''اے یاسرؓ کے گھر والو! صبر کرو' تمہارا ٹھکانا جنت ہے۔'' گویا انہیں شہادت اور جنت
کی خوش خبری پیشگی دے دی گئی تھی ـــــ حضرت خباب بن ارت ؓ کو دہکتے ہوئے
انگاروں پر لٹا دیا گیا۔ اوپر نگرانی کے لئے آدمی کھڑا ہوا ہے۔ حکم ہے جھیلو! پیٹھ کی چربی
پگھلتی ہے اور آگ سرد پڑ جاتی ہے۔

پھر خود رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ اَقدسؐ پر کیا کچھ ستم روا نہیں رکھا گیا۔ آپؐ کی راہ
میں کانٹے بچھائے جاتے ہیں جس سے آپ کے پاؤں مبارک زخمی ہو جاتے ہیں۔ یہ
کام رات کے اندھیرے میں کیا جاتا ہے' کیونکہ آپؐ علی الصبح تاروں کی چھاؤں میں
نماز کے لئے باہر نکلا کرتے تھے۔ آپؐ کے مکان میں گندگی پھینکنے کو معمول بنا لیا جاتا
ہے۔ اور یہ دونوں کام کرنے والے کون ہوتے ہیں! ـــــ آپؐ کے پڑوسی اور رشتے
میں آپؐ کے سگے چچا اور چچی یعنی ابولہب اور اُس کی بیوی اُمِّ جمیل ـــــ چادر گردن
میں ڈال کر اسے اس طرح بل دیا جاتا ہے کہ آپ ﷺ کی آنکھیں اُبل پڑتی
ہیں ـــــ سجدے کی حالت میں رحمۃ للعالمین ﷺ کے مقدس کاندھوں پر اونٹ کی
نجاست بھری اوجھری رکھ دی جاتی ہے۔ تمسخر' استہزاء' طعن وتشنیع اور فقرے چست
کرنا روز کا معمول بن جاتا ہے۔ قلب مبارک پر جو بیتتی ہو گی' وہ بیتتی ہو گی' مؤمنین
صادقین کے دلوں پر کیا گزرتی ہو گی کہ ان کے پیارے اور محبوب رسول اللہ ﷺ پر
کتنے مصائب ڈھائے اور ستم توڑے جا رہے ہیں! مگر وہ ہاتھ نہیں اٹھا سکتے تھے'
کیونکہ آپ ﷺ کو حکم تھا کہ جھیلو' برداشت کرو' صبر کرو ـــــ اور آپ ﷺ کی
وساطت سے یہی حکم تمام اہل ایمان کے لئے تھا۔

اس سے اگلا مرحلہ قتال کا ہے۔ جب دعوت منظّم ہو جاتی ہے اور یثرب کو
دارالہجرۃ بننے کی سعادت حاصل ہو جاتی ہے اور وہ مدینۃ النبیؐ بن جاتا ہے اور مسلمان
بالفعل ہجرت یعنی ترکِ وطن کر کے وہاں جمع ہو جاتے ہیں تو ایک Base مہیا ہو جاتی
ہے اور ایک چھوٹی سی شہری اسلامی ریاست قائم ہو جاتی ہے۔ اس موقع پر قتال کا مرحلہ
آتا ہے۔ چنانچہ سورۃ الحج میں بایں الفاظ قتال کی اجازت مل جاتی ہے:

﴿اُذِنَ لِلَّذِیۡنَ یُقٰتَلُوۡنَ بِاَنَّہُمۡ ظُلِمُوۡا ؕ وَ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصۡرِہِمۡ لَقَدِیۡرُ ۙ﴾
''اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے' کیونکہ
وہ مظلوم ہیں' اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔''

سورۃ النساء میں نقشہ کھینچا گیا ہے کہ کچھ لوگ ایسے بھی تھے کہ جب ان سے کہا
گیا تھا کہ ﴿کُفُّوۡۤا اَیۡدِیَکُمۡ﴾ ''اپنے ہاتھ بندھے رکھو'' تو کہتے تھے کہ ہمیں بھی جنگ
کی اجازت ہونی چاہئے' ہم بھی لڑیں' ہم یہ کر دیں گے' وہ کر دیں گے۔ اب جبکہ لڑائی
کا حکم آ گیا ہے تو لڑائی بڑی دشوار معلوم ہوتی ہے۔ تو وہاں یہ الفاظ آئے ہیں کہ:

﴿ فَلَمَّا کُتِبَ عَلَیۡہِمُ الۡقِتَالُ اِذَا فَرِیۡقٌ مِّنۡہُمۡ یَخۡشَوۡنَ النَّاسَ کَخَشۡیَۃِ
اللّٰہِ اَوۡ اَشَدَّ خَشۡیَۃً ۚ﴾ (آیت ۷۷)
''اب جو انہیں لڑائی کا حکم دیا گیا تو ان میں ایک فریق ایسا بھی ہے کہ (جس کا
دل ڈول رہا ہے اور) وہ انسانوں سے اس طرح ڈر رہا ہے کہ جیسے اللہ سے ڈرنا

چاہئے' بلکہ کچھ اس سے بھی بڑھ کر''۔

کسی انقلابی دعوت کے مذکورہ بالا تین مراحل ہوتے ہیں۔ مرحلے تین ہیں لیکن الفاظ چھ ہیں۔ گویا ہر مرحلے کے دو پہلو ہوتے ہیں ـــــ پہلا مرحلہ ہے دعوت و تربیت۔ دوسرا مرحلہ ہے تنظیم و ہجرت اور تیسرا اور آخری مرحلہ ہے جہاد و قتال۔ ان مراحل سے گزرے بغیر دنیا میں کبھی کوئی انقلاب نہیں آیا ہے ـــــ عیسائی طرز کی تبلیغ ہو سکتی ہے۔ تبلیغ کا کام آپ بھی کیجئے' کرتے چلے جایئے۔ اس سے اگلا مرحلہ نہیں آئے گا۔ وہی کام نسلاً بعد نسلٍ ہوتا رہے گا۔ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کا کام اگر آپ دیکھیں گے تو وہ نہ رفاہی کام ہے' نہ تبلیغی کام' نہ تعلیمی و علمی کام ـــــ یہ سارے کام اس انقلابی کام میں جزوی حیثیت سے تو شامل ہیں' لیکن کُل کام خالصتاً انقلابی کام کے مشابہ ہے ـــــ پھر یہ انقلابی جدوجہد مکمل اور بھرپور انقلابی جدوجہد ہے۔ نیز یہ پوری انقلابی جدوجہد انسانی سطح (Human Level) پر ہوئی ہے۔

اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے سو گزری
تنہا پسِ زنداں کبھی رسوا سرِ بازار!

تین سال کی قید شعب بنی ہاشم ہے ـــــ جس میں ایسا وقت بھی آیا ہے کہ کھانے کو کچھ نہیں تھا۔ گھاٹی کی جھاڑیوں کے پتے سب کے سب کھا لئے گئے تھے اور بھوک اور پیاس کے مارے بنی ہاشم کے بچوں کی زبانیں خشک ہو گئی تھیں' جن کو تر رکھنے کے لئے سوکھے چمڑے ابال ابال کر ان کے حلق میں بوندیں ٹپکائی جاتی تھیں۔ بنی ہاشم کا پورا قبیلہ بنی اکرم ﷺ کے ساتھ ہی اس گھاٹی میں قید کر دیا گیا تھا ـــــ اور ع ''رسوا سرِ بازارے آں شوخ ستمگارے'' کا نقشہ دیکھنا ہو تو وہ یوم طائف دیکھ لیجئے کہ جہاں ایک دن میں وہ کچھ بیت گیا جو مکہ میں دس سال میں نہیں بیتا تھا۔ طائف کے سرداروں نے دعوتِ حق اور دعوتِ توحید کو حقارت اور استہزاء کے انداز میں ٹھکرا دیا اور آپ ﷺ سے جو کچھ انہوں نے کہا اس کو سننے کے لئے بھی بڑے جگرے کی ضرورت ہے۔ نقلِ کفر کفر نہ باشد ـــــ ایک سردار نے کہا کہ ''اللہ کو تم جیسے مفلس و قلاش کے سوا رسول بنانے کے لئے کوئی اور نہیں ملا؟ اس طرح تو وہ گویا خود کعبے کے غلاف کو چاک کر رہا ہے''۔

ایک سردار نے کہا کہ ''میں تم سے بات کرنے کا بھی روادار نہیں' اس لئے کہ اگر تم سچے ہو اور واقعتاً رسول ہو تو ہو سکتا ہے کہ میں کہیں توہین کا مرتکب ہو جاؤں اور عذابِ الٰہی کا نوالہ بن جاؤں' اور اگر تم جھوٹے ہو تو کسی جھوٹے سے کلام کرنا میری شان کے خلاف ہے۔'' ایسے ہی اور جملے ان سرداروں میں سے ہر ایک نے کہے۔ پھر صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جب نبی اکرم ﷺ بظاہر احوال مایوس ہو کر لوٹنے لگے تو کچھ غنڈوں کو اشارہ کر دیا۔ اوباش لوگ آپ ﷺ کے گرد جمع ہو گئے۔ پھر وہ نقشہ جما ہے کہ جس پر آسمان و زمین لرز گئے ہوں تو کوئی تعجب نہیں۔ ان اوباشوں نے محبوبِ ربّ العالمین سیّد الاولین والآخرین ﷺ پر پتھروں کی بارش شروع کر دی۔ تاک تاک کر ٹخنے کی ہڈیوں کو نشانہ بنایا جا رہا ہے' تالیاں پیٹی جا رہی ہیں۔ حضور ﷺ کا جسدِ اطہر لہولہان ہو گیا ہے۔ نعلین شریف خون سے بھر گئی ہیں اور پیر جم گئے ہیں۔ ایک موقع پر آپ ﷺ ضعف کے مارے ذرا بیٹھ گئے ہیں تو دو غنڈے آگے بڑھتے ہیں اور بغلوں میں ہاتھ ڈال کر آپ کو کھڑا کر دیتے ہیں کہ چلو ـــــ رسول اللہ ﷺ پر ذاتی اعتبار سے ابتلاء اور امتحان کا یہ نقطۂ عروج (Climax) ہے۔ شہر سے باہر آ کر آپ ﷺ ایک پتھر سے ٹیک لگا کر تشریف رکھتے ہیں اور اس موقع پر وہ دعا آپ کی زبانِ مبارک سے نکلتی ہے کہ جس کو پڑھتے' سنتے اور سناتے وقت کلیجہ شق ہوتا ہے:

اَللّٰھُمَّ اِلَیْکَ اَشْکُوْا ضُعْفَ قُوَّتِیْ وَقِلَّۃَ حِیْلَتِیْ وَھَوَانِیْ عَلَی النَّاسِ

''اے اللہ! کہاں جاؤں' کہاں فریاد کروں' تیری ہی جناب میں فریاد لے کر آیا ہوں' اپنی قوت کی کمی اور اپنے وسائل و ذرائع کی کمی کی ـــ اور لوگوں میں جو رسوائی ہو رہی ہے' اس کی''۔

اِلٰی مَنْ تَکِلُنِیْ؟ اِلٰی بَعِیْدٍ یَجْھَمُنِیْ اَوْ اِلٰی عَدُوٍّ مَلَّکْتَ اَمْرِیْ؟

''اے اللہ! تو مجھے کس کے حوالے کر رہا ہے؟ کیا تو نے میرا معاملہ دشمنوں کے حوالے کر دیا ہے کہ وہ جو چاہیں میرے ساتھ کر گزریں؟''

اِنْ لَّمْ یَکُنْ عَلَیَّ غَضَبُکَ فَلَا اُبَالِیْ!

''پروردگار! اگر تیری رضا یہی ہے اور اگر تو ناراض نہیں ہے تو پھر میں بھی راضی ہوں'

مجھے اس تشدد کی کوئی پروا نہیں ہے۔'' (ع سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے!)

اَعُوْذُ بِنُوْرِ وَجْھِکَ الَّذِیْ اَشْرَقَتْ لَہُ الظُّلُمٰتُ

''اے ربّ! میں تیرے روئے انور کی ضیاء کی پناہ میں آتا ہوں جس سے ظلمات بھی منور ہو جاتے ہیں۔''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یومِ اُحد کے بعد نبی اکرم ﷺ سے دریافت کیا تھا کہ ''یارسول اللہ! کیا اس سے زیادہ سخت دن بھی آپ ؐ کی زندگی میں آیا ہے؟'' تو آپ ؐ نے جواب میں فرمایا تھا: ''ہاں! یومِ طائف میری زندگی کا سب سے زیادہ سخت دن تھا'' ـــــ یہ تمام مصائب و مشکلات کے ادوار نبی اکرم ﷺ پر بھی آئے اور صحابہ کرام ؓ پر بھی ـــ اس میں ایک نکتے کی بات ہے' اس پر غور کیجئے۔ وہ یہ کہ ہمارا صغریٰ کبریٰ یہ ہے کہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ سیّد وُلدِ آدم اور محبوبِ ربّ العالمین ہیں۔ دوسری طرف آپ ﷺ اور آپ ؐ کے ساتھیوں کو اپنی انقلابی جدوجہد میں بدترین مصائب و مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ان دونوں کو جوڑیئے۔ کیا اللہ اس پر قادر نہ تھا کہ انقلاب بھی آ جاتا اور محمد ﷺ کے پاؤں میں کانٹا بھی نہ چبھتا؟ یہ ہو سکتا تھا' لیکن ہوا نہیں! سوچئے کیوں نہیں ہوا؟

> اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ایسا ہو گیا ہوتا تو مجھ پر اور آپ پر حجت قائم نہ ہوتی۔ انقلاب صرف عرب میں لانا مقصود نہیں تھا' اسے پوری دنیا میں لانا تھا اور وہ انسانوں کے ہاتھوں آنا تھا۔ معجزے تو رسولوں کے لئے ہیں' عام انسانوں کے لئے تو نہیں ہیں۔ آگے جو کام کرنا تھا' اس کے لئے اُسوہ کیسے بنتا اگر محمد رسول اللہ ﷺ کو کوئی تکلیف نہ پہنچی ہوتی؟ ـــ

اس لفظ اُسوہ کو یہاں سمجھئے۔ اللہ کر سکتا تھا' لیکن اس نے نہیں کیا ـــ اس کا حکم تو یہی تھا کہ ''اے محمد ؐ! جھیلو' برداشت کرو'' ـــ اللہ کی شان بہت اعلیٰ و ارفع ہے۔ اس لئے صرف بطورِ تفہیم بہت ڈرتے ڈرتے عرض کرتا ہوں کہ اگر ہم اپنے احساسات پر قیاس کریں تو کیا بیتی ہو گی اللہ پر! جب طائف میں اس کا محبوب پتھروں کی زد میں تھا ـــ جب تالیاں پٹ رہی تھیں ـــ لیکن اُس کا فیصلہ یہی تھا کہ اے محمد ؐ! صبر کرو' جھیلو' برداشت کرو۔ وہی بات جو آنجناب ﷺ اپنے صحابہ ؓ سے کہہ رہے ہیں۔ جیسا کہ آلِ یاسر پر ظلم و ستم کے واقعے کے دوران ذکر ہوا۔ اسی طرح مکی دور میں مصائب و شدائد' ایذا رسانی' جور و تعدی اور طنز و استہزاء کے مختلف مواقع پر رسول اللہ ﷺ کو بھی وحی الٰہی کے ذریعے یہ ہدایات مل رہی ہیں کہ: ﴿وَلِرَبِّکَ فَاصْبِرْ﴾ ـــ ﴿فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِیْلًا﴾ ـــ ﴿فَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ﴾ ـــ مختلف اسالیب سے صبر کی ہدایت اور تلقین ہو رہی ہے: ﴿فَاصْبِرْ کَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ ''جیسے ہمارے اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا ہے ویسے آپ بھی صبر کیجئے۔'' ـــ ﴿وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُکَ اِلَّا بِاللّٰہِ﴾ ''صبر کیجئے اور آپ کا سہارا بس اللہ ہی ہے''۔ یعنی صبر کے لئے بھی کوئی سہارا چاہئے تو آپ کا سہارا ہم خود ہیں ـــ ﴿فَاصْبِرْ لِحُکْمِ رَبِّکَ وَلَا تَکُنْ کَصَاحِبِ الْحُوْتِ﴾ ''پس صبر کیجئے اور اپنے ربّ کے حکم کا انتظار کیجئے اور کہیں مچھلی والے کی طرح جلدی نہ کر لیجئے گا'' ـــ ﴿وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ﴾ ''اور صبر کیجئے' اللہ محسنین یعنی خوب کاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا''۔

یہ سب کچھ کیوں ہے؟ اس کو جانئے اور سمجھئے۔ یہ اس لئے ہے کہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ اقدس ﷺ کو ہمارے لئے اسوہ بننا تھا۔ یہ سب کچھ نہ ہوتا تو آپ ؐ کی ذاتِ گرامی ہمارے لئے اُسوہ کیسے بنتی! ـــ یہ مجھ پر حجت ہے' آپ پر حجت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے جو کچھ کیا' وہ خالص انسانی سطح (Human Level) پر کیا ہے' سارے دکھ اٹھا کر کیا ہے' فاقے جھیل کر کیا ہے' پتھراؤ برداشت کر کے کیا ہے' قید و بند کی تکالیف اٹھا کر کیا ہے' اپنے دندانِ مبارک شہید کروا کر کیا ہے' اپنے عزیزوں اور جاں نثاروں کے لاشے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر کیا ہے' پیٹ پر ایک نہیں دو دو پتھر باندھ کر کیا ہے ـــ یہ سارے مصائب جھیلے ہیں' تب انقلاب برپا ہوا ہے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مطہرہ کا سب سے زیادہ نمایاں اُسوہ کیا ہوا؟ یہ ساری گفتگو ﴿لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ

رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ﴾ کے تحت ہو رہی ہے۔ اس اعتبار سے پہلا اُسوہ تو یہ ہوا کہ بحیثیت مجموعی نبی اکرمﷺ کی جدوجہد خالصتاً انقلابی جدوجہد کے مشابہ ہے۔ جبکہ دوسرا اُسوہ یہ ہے کہ یہ ساری جدوجہد انسانی سطح (Human Level) پر قدم بقدم مصائب و تکالیف، جور و تعدی اور ظلم و ستم جھیل کر ہوئی ہے۔

نصرتِ الٰہی کا ظہور

اس موقع پر مبادا کوئی اشکال پیدا ہو جائے یا مغالطہ لاحق ہو جائے، لہٰذا عرض کر دوں کہ اس میں شک نہیں کہ اس جدوجہد میں اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید بھی آئی ہے۔ اور اس نصرت و تائید کا دروازہ اب بھی کھلا ہوا ہے۔ ؎

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی!

لیکن یہ نصرت و تائید کب آئی ہے؟ یہ اُس وقت آئی ہے جب مؤمنین صادقین جو کچھ کر سکتے تھے وہ سب کر گزرے۔ اس سے پہلے نصرتِ الٰہی نہیں آیا کرتی۔ اس نصرت کی لازمی شرط یہ ہے کہ: ﴿یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ وَیُثَبِّتْ اَقْدَامَکُمْ ﴾ (محمد: ۷) ''اے ایمان والو! اگر تم اللہ (کے دین) کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا۔'' غزوۂ بدر کے موقع پر جنگ سے ایک رات قبل نبی اکرمﷺ نے دعا فرمائی تھی کہ ''اے اللہ! میں نے پندرہ برس کی کمائی لا کر میدان میں ڈال دی ہے۔ اگر کل یہ شہید ہو گئے تو دنیا میں تیرا نام لینے والا کوئی نہیں ہو گا' اس لئے کہ میں آخری رسول ہوں اور میری پندرہ برس کی کمائی یہ ہے کہ جو دین کی سربلندی کے لئے میں نے میدان میں لا ڈالی ہے ــــ'' چنانچہ بدر کے معرکہ میں اللہ کی نصرت آئی اور ۳۱۳ بے سروسامان مؤمنین صادقین کے ہاتھوں کیل کانٹے سے لیس ایک ہزار لشکر کو شکست نصیب ہوئی ــــ لیکن ہمارا یہ حال ہے کہ بچ بچ کر اور تحفظ کا خیال رکھ رکھ کر اور اپنی جیبوں کو سکیڑ سکیڑ کر رکھنے کے ساتھ ہم یہ امید رکھیں کہ اللہ کی تائید و نصرت ہمیں حاصل ہو جائے تو ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ اپنے حلوے مانڈے میں ہم کوئی کمی کرنے کے لئے آمادہ نہیں' کاروبار میں سود شامل ہے تو اس کو چھوڑنے کے لئے ہم تیار نہیں' کیونکہ اس طرح تو کاروبار سمٹ اور سکڑ جائے گا۔ دین کے کام کے لئے وقت لگائیں تو پھر ہمارا یہ معیار اور status کیسے برقرار رہے گا! ہم تو بچ بچ کر آرام سے گھروں میں بیٹھے رہیں اور یہ چاہیں کہ اللہ اپنی نصرت و تائید لئے ہمارے پیچھے پیچھے آئے کہ لیجئے میری نصرت و تائید قبول فرمائیے' تو یہ ہونے والی بات نہیں ہے۔ ع ایں خیال است و محال است و جنوں! یہ نہ کبھی ہوا ہے اور نہ کبھی ہو گا۔ محبوب ربّ العالمینﷺ اور آپؐ کے صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے ساتھ نہیں ہوا تو ہمارے سر پر کون سا سرخاب کا پر لگا ہوا ہے کہ ہمارے ساتھ یہ معاملہ ہو جائے گا؟ کبھی نہیں ہو سکتا! ہوتا تو نبی اکرمﷺ کے ساتھ ہوتا۔ اس معاملے میں استثناء (exception) اگر ہوتا تو اس قاعدہ کلیہ سے مستثنیٰ آپﷺ ہی ہو سکتے تھے۔

نصرت و تائید کے ضمن میں آپ کو یہ بھی بتاتا چلوں کہ یوم طائف کے موقع پر نبی اکرمﷺ نے جو دعا کی تھی اس کے بارے میں یہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ ع اجابت از درِ حق بہر استقبال می آید ــــ چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ فوراً ملک الجبال یعنی وہ فرشتہ جو پہاڑوں کی دیکھ بھال کے لئے مامور ہے' حاضر ہو کر عرض کرتا ہے کہ ''حضور! اللہ نے مجھے آپؐ کی خدمت میں بھیجا ہے کہ اگر آپ حکم دیں تو میں ان پہاڑوں کو ٹکرا دوں جن کے مابین وادی میں طائف کا شہر واقع ہے تاکہ اس کے رہنے والے پس کر سرمہ بن جائیں'' ــــ اس پر رحمۃ للعالمینﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ ''میں لوگوں کے عذاب کے لئے نہیں بھیجا گیا۔ اگرچہ یہ لوگ مجھ پر ایمان نہیں لائے لیکن کیا عجب کہ ان کی آئندہ نسلوں کو اللہ تعالیٰ ایمان کی توفیق عطا فرمائے!'' ــــ دیکھ لیجئے کہ جس موقع پر غیبی نصرت بھیجی گئی وہ کون سا موقع تھا؟ یہ وہ موقع تھا کہ جس سے سخت دن خود حضورﷺ کے بقول آپؐ کی زندگی میں کوئی اور نہیں گزرا ــــ اس سے پہلے بھی خفی اور غیبی امداد و نصرت ہوئی ہے۔ لیکن نصرتِ الٰہی کا اصل ظہور ہوتا ہے یوم طائف کے بعد۔ چنانچہ فوری طور پر تو مَلک الجبال کی حاضری ہے۔ لیکن اب ٹھنڈی ہوائیں یثرب کی طرف

سے آنے لگیں۔ آپ ﷺ تو مکہ سے مایوس ہو کر طائف تشریف لے گئے' لیکن نصرت و حکمتِ الٰہی نے مدینہ منورہ کی طرف سے کھڑکی کھول دی ــــ یوم طائف کے سلسلہ میں مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم نے اپنی کتاب ''النبی الخاتم ﷺ'' میں بہت ہی عمدہ نکتہ ارشاد فرمایا ہے کہ ''یوم طائف نبی اکرم ﷺ کی زندگی کا Turning Piont تھا۔ اُس دن تک اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے نبیؐ کو دشمن کے حوالے کیا ہوا تھا کہ جس طرح چاہو ہمارے رسولؐ کے صبر کا امتحان لے لو' جس طرح چاہو اُن کی استقامت کو جانچ پرکھ لو' ہمارے رسولؐ کی سیرت و کردار کو خوب ٹھونک بجا کر دیکھ لو ــــ اُس دن کے بعد نبی اکرم ﷺ کے لئے خصوصی نصرت اور تائید کا ظہور شروع ہوتا ہے۔''

آنحضور ﷺ کی اجتماعی جدوجہد میں قرآن کا مقام

اب میں سیرتِ مطہرہ اور خاص طور سے اس اسوۂ حسنہ کے ان تین مراحل کے اعتبار سے ایک تجزیہ آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں جن کا میں نے آغاز میں ذکر کیا تھا ــــ اس کے بعد میں نے اُسوۂ حسنہ کے ضمن میں دو باتیں بحیثیت مجموعی بیان کی ہیں کہ محض آرزو یا مرثیہ پڑھنے سے کچھ نہیں ہوتا ــــ دین کا دل میں درد ہے تو ہمیں اُسوۂ حسنہ کے مطابق انقلابی جدوجہد کرنا ہو گی۔ ہمیں مرثیہ پڑھنا اور رونا بہت آتا ہے۔ لیکن اگر یہ رونا نبی اکرم ﷺ کے اجتماعی اُسوۂ حسنہ کے ساتھ ہو تو یہ سونا ہے' اس کے مطابق عمل نہیں ہے تو یہ ٹسوے ہیں' جو عورتیں بہایا کرتی ہیں' جن کی دنیا میں کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔

اب ذرا ان تین اجزاء کو لیجئے' جن کو میں نے دو دو لفظوں کے جوڑوں کے ساتھ تین مراحل کے عنوانات کے تحت آپ کے سامنے پیش کیا تھا۔

سب سے پہلی بات یہ کہ ''دعوت و تربیت'' کے ضمن میں نبی اکرم ﷺ کا اُسوہ یہ ہے کہ ان دونوں کاموں کا مرکز' منبع' مدار اور محور قرآن اور صرف قرآن رہا ہے۔ آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے حکم دیا گیا تھا کہ لوگوں کو ایمان کی دعوت دو قرآن کے ذریعے ــــ تذکیر کرو قرآن کے ذریعے ــــ انذار کرو قرآن کے ذریعے ــــ تبشیر کرو قرآن کے ذریعے ــــ نصیحت اور موعظت کرو قرآن کے ذریعے ــــ بحث و مباحثہ اور جدال و محاجہ کرو اس قرآن کے ذریعے ــــ تبلیغ کرو قرآن کی ــــ! دعوت کی مختلف سطحوں کے لئے یہی الفاظ آتے ہیں۔

اب ذرا ان الفاظ کے مطابق وہ ہدایاتِ الٰہی سنئے جو قرآن حکیم میں نازل ہوئی ہیں ــــ فرمایا: ﴿فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ﴾ (ق:۴۵) ''پس یاد دہانی کراؤ بذریعہ قرآن ہر اُس شخص کو جو میری پکڑ اور سزا سے ڈرتا ہو'' ــــ ﴿وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ﴾ (الانعام:۱۹) ''اور میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے تاکہ میں اس کے ذریعے تمہیں بھی خبردار کردوں اور اُن کو بھی جن کو یہ (قرآن) پہنچے'' ــــ ﴿فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا﴾ (مریم:۹۷) ''پس (اے نبیؐ!) ہم نے اس کتاب کو آپؐ کی زبان میں اس لئے آسان بنایا ہے کہ آپؐ اس کے ذریعے خدا ترسوں کو بشارت پہنچا دیں اور جھگڑالو قوم کو اس کے بُرے انجام سے آگاہ اور خبردار کر دیں'' ــــ اس آیت میں خاص بات نوٹ کرنے کی یہ ہے کہ لِتُبَشِّرَ کے ساتھ بھی ''بِهٖ'' اور ''تُنْذِرَ'' کے ساتھ بھی ''بِهٖ'' آیا ہے ــــ یعنی دونوں کام بشارت و انذار اسی کتاب ''قرآن'' کے ذریعے ہوں گے ــــ مزید فرمایا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ﴾ (المائدۃ:۶۷) ''اے ہمارے رسول! پہنچایئے جو کچھ نازل کیا گیا ہے آپؐ کی طرف آپؐ کے ربّ کی جانب سے'' ــــ تبلیغ کس کی؟ قرآن کی! ﴿اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا﴾ (بنی اسرائیل:۹) ''بے شک یہ قرآن اس راستے کی رہنمائی کرتا ہے جو بالکل سیدھا ہے اور بشارت دیتا ہے ان اہل ایمان کو جو نیک عمل کرتے ہیں کہ ان کے لئے بہت بڑا اجر ہے''۔ بشارت دینے والا کون؟ قرآن! ــــ اس انذار اور تبشیر بالقرآن کا ذکر سورۃ الکہف کے آغاز ہی میں بڑے مہتم بالشان انداز میں ہوا۔ فرمایا:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰي عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۞ قَيِّمًا

لِّيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا ﴿﴾

''شکر اور تعریف کے لائق ہے وہ اللہ جس نے اپنے بندے پر کتاب اتاری اور اس میں اس نے کوئی کجی نہیں رکھی' بالکل سیدھی اور ہموار واستوار تا کہ وہ لوگوں کو اپنی جانب سے ایک سخت عذاب سے آگاہ کر دے اور ایمان لانے والوں کو' جو نیک عمل کر رہے ہیں' اس بات کی خوشخبری سنا دے کہ ان کے لئے بہت اچھا اجر ہے''۔

میں نے جو آیات آپ کو سنائیں ان سب کا حاصل یہ نکلا کہ:

دعوتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا مرکز ومحور اور مبنیٰ و مدار صرف اور صرف قرآن ہے۔ انذار ہو یا تبشیر' تبلیغ ہو یا تذکیر' مباحثہ ہو یا مجادلہ' موعظہ ہو یا نصیحت' یہ تمام کام صرف قرآن مجید ہی کے ذریعے سرانجام دیئے جائیں گے۔

''دعوت'' کا لفظ ہمارے دین کی غالباً سب سے جامع اصطلاح ہے' جس کے لئے سورۃ النحل کی آیت ۱۲۵ سے استشہاد کیا جا سکتا ہے' جس میں دعوت کے ضمن میں یہ جامع ومانع ہدایت دی گئی ہے کہ: ﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ ط﴾ ''(اے نبیؐ!) دعوت دو اپنے ربّ کے راستے کی طرف حکمت اور موعظہ حسنہ کے ساتھ' اور لوگوں سے مباحثہ ومجادلہ کرو اس طور سے جو نہایت ہی عمدہ ہو۔'' یہ ہے اسوہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ کا ___ سیرتِ مطہرہ میں آپ کو یہ بات نہیں ملے گی کہ کہیں نبی اکرم ﷺ نے طویل تقریر وخطاب فرمایا ہو۔ جہاں تشریف لے گئے تو یہی فرمایا کہ ''لوگو! میرے اوپر اللہ کی طرف سے ایک کلام نازل ہوا ہے اسے سن لو!'' ___ معلوم ہوا کہ فلاں وادی میں کوئی قافلہ آ کر اترا ہے تو وہاں تشریف لے گئے اور فرمایا تو یہ فرمایا کہ ''لوگو! میرے پاس اللہ کا اتارا ہوا کلام ہے' وہ میں تمہارے سامنے پیش کرتا ہوں''۔ مجمعوں میں آپؐ قرآن پڑھ پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ ہمیں تو قرآن کا ترجمہ کر کے اس کا مطلب اور مفہوم سمجھانا پڑتا ہے' جبکہ وہاں معاملہ یہ تھا کہ از دِل خیزد بر دِل ریزد۔ وہاں تو حال یہ تھا کہ نبی اکرم ﷺ کی زبانِ مبارک سے قرآن سنا اور سعید روح کے قلب وذہن اور رگ وپے میں سرایت کر گیا۔ بہت سے جلیل القدر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین قرآن اور محض قرآن سن کر مشرف باسلام ہوئے۔ عمر بن الخطاب کو عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کس نے بنایا؟ قرآن نے! یہ سورۂ طٰہٰ کی معجز نمائی تھی جس نے عمرؓ کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا ___ ع دگرگوں کرد تقدیرِ عمرؓ را!

ابوذر غفاریؓ جو ڈکیتی کا پیشہ رکھنے والے ایک قبیلے کے فرد تھے' انہیں اس مقام تک کس نے پہنچایا کہ ع ''رہزنان از حفظِ اُو رہبر شدند!'' جن کے متعلق نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ ''جس نے زہدِ عیسیٰ علیہ السلام دیکھنا ہو تو وہ میرے ساتھی ابوذرؓ کو دیکھ لے!'' لبیدؓ شعرائے سبعہ معلقہ کے سلسلے کے آخری شاعر ہیں' ان کے ایک شعر پر سوقِ عکاظ میں تمام شعرائے وقت نے ان کو سجدہ کیا تھا ___ وہ ایمان لے آئے تو قرآن کے ذریعے۔ کسی نے ان سے پوچھا کہ آپ اب شعر نہیں کہتے؟ تو جواب ملا: أَبَعْدَ الْقُرْآنِ؟ یعنی قرآن کے نزول کے بعد میری کیا مجال کہ میں شاعری کے میدان میں طبع آزمائی کروں ___ طفیلؓ دوسی یمن کے رہنے والے قادر الکلام شاعر تھے۔ جب مکہ آئے تو قریش کے بہکانے پر کانوں میں روئی ٹھونس لی کہ مبادا کانوں میں کلام اللہ پڑ جائے۔ لیکن ایک دن خود ہی رسالت مآب ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر قرآن سننے کی فرمائش کرتے ہیں اور جیسے ہی کچھ حصہ سنتے ہیں' بے اختیار پکار اٹھتے ہیں کہ یہ کسی انسان کا کلام ہو ہی نہیں سکتا' بے شک یہ وحی الٰہی ہے ___ اور اُسی وقت مسلمان ہو جاتے ہیں ___ الغرض اس کتابِ ہدایت کے طفیل' جو رہزن تھے وہ رہبر بن گئے' جو اُمّی تھے' اَن پڑھ تھے وہ دنیا کے لئے معلم بن گئے' جو زانی وشرابی تھے' وہ عصمتوں کے محافظ اور مکارمِ اخلاق کے علمبردار بن گئے۔ یہ سب کچھ قرآن کی معجز نمائی تھی۔

میری اس گفتگو کا نتیجہ بھی یہ نکلا کہ دعوت وانقلابِ نبوی کا اساسی منہج عمل پورے کا پورا قرآن مجید کے گرد گھومتا ہے ___ یا سادہ الفاظ میں یوں کہہ لیا جائے کہ نبی اکرم

ﷺ کا آلۂ انقلاب ہے قرآن حکیم! اس بات کو مولانا حالی مرحوم نے تو نہایت سادہ اور سلیس الفاظ میں یوں بیان کیا کہ ؎

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا — اور اِک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا!
وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادیؐ — عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی!

اور علامہ اقبال مرحوم نے اسی بات کو یوں الفاظ کا جامہ پہنایا ؎

در شبستانِ حرا خلوت گزید — قوم و آئین و حکومت آفرید!

پھر علامہ مرحوم نے حد درجہ پُرشکوہ الفاظ میں اس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے کہ:

گر تو می خواہی مسلمان زیستن — نیست ممکن جز بقرآن زیستن!
آں کتاب زندہ قرآنِ حکیم — حکمتِ اُو لایزال است و قدیم
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — ایں کتابے نیست چیزے دیگر است!
مثلِ حق پنہاں و ہم پیدا است ایں — زندہ و پائندہ و گویا است ایں!
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود — جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود!

اب ایک بات اچھی طرح سمجھ لیجئے۔ اگر کوئی دعوت اس قرآن سے پرے پرے دی گئی ہو' قرآن کو Bypass کر کے دی گئی ہو' قرآن کے بجائے کسی شخصیت کے لٹریچر کے بل پر چل رہی ہو' کسی اور کی تصانیف پر چل رہی ہو' وطنیت و قومیت کے نام پر چل رہی ہو تو وہ دعوت اُسوۂ رسول ﷺ سے ہٹی ہوئی ہے ــــ اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں کہتا ــــ اُسوۂ رسولؐ تو یہ ہے کہ دعوت و تبلیغ' انذار و تبشیر' تلقین و نصیحت' ان سب کا مبنیٰ' مدار اور مرکز و محور صرف اور صرف قرآن ہو گا۔

تربیت و تزکیہ کا مسنون ذریعہ ــــ قرآن حکیم

اب آیئے چوتھی بات کی طرف ــــ وہ ہے تربیت۔ یہ معاملہ اس اعتبار سے سب سے زیادہ تکلیف دہ ہے کہ تربیت اور تزکیۂ نفس کے بارے میں یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ شاید اس کے لئے تو یہ قرآن مفید ہے ہی نہیں' کتاب اللہ اس کام کے لئے مؤثر ہی نہیں ہے' لہٰذا ذکر کے کچھ اور طریقے ایجاد کرنے پڑیں گے' تربیت کا کوئی دوسرا نظام بنانا پڑے گا ــــ گویا نبی اکرم ﷺ کا اسوہ اس کے لئے مکمل رہنمائی نہیں کر سکتا۔ اس کے لئے دلیل یہ دی جاتی ہے کہ آنحضور ﷺ کی شخصیت کا جو اثر ہوتا تھا وہ اب ہمارے لئے ممکن نہیں ہے' کیونکہ آپ ﷺ کا وجودِ اقدس ہمارے درمیان موجود نہیں۔ تصوف کے حلقوں میں جو دیانت دار اور خدا ترس لوگ ہیں' وہ یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ ہمارے ہاں تربیت' تزکیہ اور سلوک کے جو طریقے رائج ہیں' وہ مسنون بہرحال نہیں ہیں۔ دیانت کا تقاضا ہے کہ ہم بھی اس کو تسلیم کریں۔ ضربیں لگانے کے طریقے کو مسنون ٹھہرانے کے لئے کہاں سے دلیل لائیں گے؟ یہ بات نہ تو کسی حدیث سے ثابت ہے نہ کسی صحابی سے اور نہ ہی کسی تابعی سے۔ جو حضرات اس کے قائل ہیں وہ زیادہ سے زیادہ یہ عذر و معذرت یا Plea لاتے ہیں کہ ان طریقوں کو انہوں نے اپنے تجربات میں مفید پایا ہے ــــ ٹھیک ہے' مجھے اس سے انکار نہیں ــــ ایسا ممکن ہے کہ یہ طریقے مفید ہوں ــــ لیکن یہ مانئے اور اس کا اعلان بھی کیجئے کہ یہ طریقے مسنون نہیں ہیں۔ یہ طریقے اسوۂ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے مطابقت نہیں رکھتے۔ کیا ایسے حضرات کا یہ خیال ہے کہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے تزکیہ نہیں کیا؟ قرآن حکیم میں تین مقامات پر تلاوت کے بعد تزکیہ ہی کا ذکر آتا ہے ــــ یَتۡلُوۡا عَلَیۡهِمۡ اٰیٰتِهٖ وَیُزَکِّیۡهِمۡ ــــ

اس تزکیہ کا ذریعہ کیا ہے؟ دعوت و تبلیغ کا مدار اور انذار و تبشیر کا مرکز و محور تو قرآن ہے اور تذکیر و نصیحت کا مبنیٰ بھی قرآن ہی ہے' اس بات کو ہم نے قرآن کی آیات ہی سے سمجھ لیا۔ اس کے سمجھنے کا معاملہ آسان ہے' البتہ تزکیہ کا معاملہ تھوڑا سا باریک ہے۔ تزکیہ و تربیت کے لئے بھی ہمیں ہر حال میں قرآن ہی کی طرف رجوع کرنا ہو گا۔ آیئے اس بات کو قرآن ہی سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سورۂ یونس (آیت ۵۷) میں فرمایا:

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدۡ جَآءَتۡكُمۡ مَّوۡعِظَةٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی

الصُّدُوْرِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۞﴾

''اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے ربّ کی طرف سے نصیحت آ گئی ہے۔ یہ وہ
چیز ہے جو دلوں کے امراض کی شفا ہے اور جو اسے قبول کر لیں ان کے لئے
ہدایت اور رحمت ہے''۔

چنانچہ دل کے تمام امراضِ دینیہ و اخلاقیہ کے لئے شفاء یہ قرآن مجید ہے۔ ذکر' یہ قرآن ہے: ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحٰفِظُوْنَ ۞﴾ (الحجر) جو اس ذکر کو By pass کرے گا اس کے متعلق کم سے کم یہ بات کہی جائے گی کہ وہ غیر مسنون طریقے پر عمل کر رہا ہے۔ امراضِ قلبیہ وصدریہ کا علاج جو اس سے علیحدہ کیا جائے گا وہ اسوۂ رسول ﷺ نہیں ہوگا۔ اپنی جگہ مؤثر ہوا کرے ـــــ اسوۂ رسولؐ کے نقشے سے وہ ہٹا ہوا ہے۔

دیکھئے ہمارے ہاں ایک ہے ''وعظ''۔ آج یہ وعظ ہمارے ہاں گالی بن گیا ہے۔ لوگ پھبتی چست کرتے ہیں کہ لو جی وعظ کر رہے ہیں۔ گویا بہت گھٹیا سی بات کہی جا رہی ہے۔ یہ ہر دَور کی ایک چھاپ ہوتی ہے۔ ایک زمانے میں ایسے وعظ ہوا کرتے تھے جو بہت مؤثر ہوتے تھے۔ سامعین ان سے اپنے قلوب میں گداز اور ایک روشنی محسوس کرتے تھے' ان کے جذبات کو جلا ملتی تھی۔ لیکن ہمارے ہاں' میری یادداشت کے مطابق' جو ''وعظ'' ہوا کرتے تھے ان میں بھی قرآن نہیں ہوتا تھا (الا ماشاء اللہ) اکثر وعظ ''مثنویٔ مولویٔ معنوی'' کی بنیاد پر ہوتے تھے۔ اس کی بھی ایک تاثیر تھی' اس سے انکار نہیں۔ اکثر ہوتا یہی تھا کہ ایک خاص ترنم آمیز لہجے میں مثنوی کو پڑھا جاتا تھا۔ میرے ہوش کے زمانے میں اکثر وعظوں کی یہی نوعیت ہوتی تھی جو میں نے خود سنے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ موعظہ حسنہ اور نصیحت یہ قرآن ہی ہے۔ دلوں میں اترنے والی چیز یہ قرآن ہے' جذبات کو جلا بخشنے والی چیز یہ قرآن ہے۔

علامہ اقبال مرحوم نے اپنے اشعار میں بہت سے قرآنی حقائق کی نہایت عمدہ اور اعلیٰ وارفع ترجمانی اور وضاحت کی ہے ـــــ چنانچہ روایتی واعظوں کے متعلق وہ کہتے ہیں ع ''معنیٰ او پست و حرفِ او بلند'' یعنی الفاظ بڑے بھاری بھرکم اور معنی تلاش کرو تو ہیں ہی نہیں ـــ دھواں دھار بات ہے لیکن معنی سے بالکل خالی ـــ علامہ مزید کہتے ہیں ؎

از خطیب و دیلمی گفتارِ او
با ضعیف و شاذ و مرسل کارِ او

یعنی اپنے وعظوں کے لئے حدیث لائیں گے تو کوئی بہت ہی ضعیف یا شاذ حدیث لائیں گے۔ واعظوں کی یہ بڑی کمزوری شمار کی گئی ہے کہ ان کے وعظ میں اکثر و بیشتر کمزور و ضعیف حدیثیں ہوتی ہیں۔ امام غزالیؒ اس سے نہ بچ سکے۔ ''احیاء العلوم'' جیسی کتاب بھی اس سے مبرا نہیں۔ وہ کسی موضوع پر سات آٹھ صحیح حدیثیں درج کرنے کے بعد دو تین ضعیف حدیثیں بھی شامل کر دیتے ہیں۔ پتہ نہیں ایسا کیوں ہوا! شاید ان کا جی بھرتا نہیں تھا اور وہ چاہتے تھے کہ دو تین دلیلیں اور دے دی جائیں۔ حالانکہ ایک بات صحیح حدیث سے ثابت ہو جاتی ہو تو پھر اس کے لئے ضعیف احادیث سے استدلال کی کیا ضرورت ہے! ہمارے ہاں جو عام واعظین ہیں ان کا حال یہ ہے کہ ساری گفتگو اور وعظ کا مرکز ومحور صرف ضعیف احادیث ہوں گی ـــــ الا ماشاء اللہ۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کسی چیز سے ہمارے واعظین کو اعتناء نہیں ہے تو وہ یہ قرآن ہے۔

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے اپنے والد مرحوم کے یہ حد درجہ سادہ مگر پُر تاثیر اشعار حواشیٔ ترجمہ قرآن میں درج کئے ہیں ؎

سنتے سنتے نغمہ ہائے محفلِ بدعات کو
کان بہرے ہو گئے دل بے مزہ ہونے کو ہے
آؤ سنوائیں تمہیں وہ نغمۂ مشروع بھی
پارہ جس کے لحن سے طورِ ہدیٰ ہونے کو ہے
حیف گر تاثیر اُس کی تیرے دل پر کچھ نہ ہو
کوہ جس سے خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا ہونے کو ہے!

میں کہا کرتا ہوں کہ ایک محفل سماع جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی بھی ہوتی تھی' لیکن

اس میں کیا سنا جاتا تھا؟ قرآن ـــــ ﴿وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا﴾ (الاعراف:۲۰۴) ''اور جب قرآن تمہارے سامنے پڑھا جائے تو اسے توجہ سے سنو اور خاموش رہو۔'' بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ان سے فرمائش کر کے قرآن کریم سننا چاہا۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضورؐ آپ کو سناؤں! آپؐ پر تو قرآن نازل ہوا ہے۔ آنجناب ﷺ نے فرمایا کہ ہاں سناؤ' مجھے دوسروں سے سن کر حظ اور لطف حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے سورۃ النساء پڑھنی شروع کی اور جب اکتالیسویں آیت پر آئے تو حضور ﷺ نے فرمایا: حَسْبُکَ حَسْبُکَ ''بس کرو' بس کرو!'' حضور ﷺ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے جب حضرت عبداللہؓ نے یہ آیت پڑھی: ﴿فَکَیْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ کُلِّ اُمَّۃٍ بِشَهِیْدٍ وَّجِئْنَا بِکَ عَلٰی هٰۤؤُلَآءِ شَهِیْدًا ﴾ ''پس سوچو کہ اُس وقت کیا ہوگا جب ہم ہر اُمت میں سے ایک گواہ لائیں گے اور ان لوگوں پر (اے محمدؐ) آپ کو گواہ کی حیثیت سے کھڑا کریں گے۔'' یہ ہے سماع جناب محمد رسول اللہ ﷺ کا!

وعظ کا مقصد کیا ہے؟ جذبات کے اندر ایک حرارت پیدا کرنا ـــــ کیا یہ حرارت قرآن سے پیدا نہیں ہوتی؟ گویا تزکیہ نفس کے لئے تو غالباً یہ دنیا کی ناکام ترین کتاب سمجھی گئی ہے۔ نعوذ باللّٰہ من ذٰلک۔ نہایت افسوس کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ قرآن حکیم کی سب سے زیادہ ناقدری اس کوچے میں آ کر ہوئی ہے۔ اس کا مرثیہ بھی اقبال نے کہا ہے ؎

صوفیٔ پشمینہ پوشِ حال مست
از شرابِ نغمۂ قوال مست!
آتش از شعرِ عراقی در دلش
در نمی سازد بقرآں محفلش!

عراقی' جامی یا رُومی کا شعر سنیں گے تو وجد میں آ جائیں گے' لیکن قرآن سنیں گے تو کوئی اثر ہی نہیں ہوگا' بلکہ قرآن ان کی محفلوں میں جگہ ہی نہیں پاتا۔ حالانکہ اگر جذبات کی جلا' ان میں حرارت اور سوز و گداز اور کیف و سرور کی کیفیات مطلوب ہوں تو اس مقصد کے لئے بھی یہ قرآن ہے جو جناب محمد رسول اللہ ﷺ پر اُترا۔ ان کے لئے بھی سب سے بڑا منبع و سرچشمہ قرآن مجید ہی ہے۔

اسوۂ حسنہ کے ضمن میں اب تک قدرے تفصیل کے ساتھ میں نے جو اُسوے گنوائے ہیں' انہیں پھر ذہن میں تازہ کر لیجیے۔ پہلا اسوہ ہے دعوت و تبلیغ' انذار و تبشیر اور موعظہ و تذکیر' ان سب کو جمع کر لیجیے' ان سب کا مرکز و محور اور مبنیٰ و مدار ہے قرآن۔ دوسرا اُسوہ ہے تزکیہ و تربیت' اس کی اساس' جڑ اور بنیاد بھی قرآن ہی ہے۔ ذکر قرآن سے ـــــ محفل سماع قرآن سے ـــــ وعظ قرآن سے ـــــ تطہیر فکر قرآن سے ہوگی' اور فکر کی تطہیر ہوگی تو اعمال خود بخود درست ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ انسانی شخصیت فکر و عمل کا مجموعہ ہے اور یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں' بایں معنی کہ ''گندم از گندم بروید' جو ز جو'' کے مصداق غلط فکر' غلط عمل ہی کو جنم دے سکتا ہے اور صحیح عمل کے لئے صحیح فکر ناگزیر ہے۔ گویا اگر کسی انسان کی فکر کی تطہیر ہو جائے اور غلط افکار و نظریات اور فاسد خیالات اس کے قلب و ذہن سے پت جھڑ کے پتوں کی طرح جھڑتے چلے جائیں تو اعمال صالحہ اور اخلاقِ حسنہ کے برگ و بار بلاتکلف از خود نمایاں ہو جائیں گے۔ اسی عمل (Phenomenon) کو قرآن حکیم ''یُکَفِّرْ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ'' بھی قرار دیتا ہے اور یُبَدِّلُ اللّٰهُ سَیِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ بھی ـــــ اور یہی ربط و تعلق ہے اس میں کہ تلاوتِ آیات کے متصلاً بعد تزکیہ کا ذکر قرآن میں آیا ہے: یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَکِّیْهِمْ ـــــ واللہ اعلم!

تنظیم کے لئے اُسوۂ رسولؐ سے رہنمائی

اب آیئے دوسرے مرحلے کی طرف' یعنی تنظیم و ہجرت ـــــ تنظیم کے ضمن میں جناب محمد رسول اللہ ﷺ کا کیا اسوہ رہا ہے! اب اس مسئلہ کو ہمیں سمجھنا ہے۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ تنظیم کے بغیر کوئی بھی اجتماعی کام نہیں ہو سکتا۔ یہاں تک کہ آپ کو

لوگوں کی جیبیں کاٹنی ہوں تو بھی ایک تنظیم قائم کرنی پڑتی ہے۔ گرہ کٹوں کے بھی گروہ (Gangs) ہوتے ہیں۔ ڈاکہ ڈالنا ہو تو گینگ بنانا ہوگا۔ سوشلزم لانا ہو تو آپ کو تنظیم بنانی ہوگی ـــــ اور اگر اسلام کے لئے کوئی کام کرنا ہے تو بھی تنظیم سے مفر نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ کا قول ہے: لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِجَمَاعَةٍ. یعنی جماعت کے بغیر کوئی اسلام نہیں۔ اور نبی اکرم ﷺ کا تو حکم ہے کہ:

((اَنَا آمُرُكُمْ بِخَمْسٍ : بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ))

''(مسلمانو!) میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دے رہا ہوں: (i) جماعت کا' (ii) سننے کا' (iii) اطاعت کرنے کا' (iv) ہجرت کا' اور (v) اللہ کے راستے میں جہاد کا۔''

ہمارا آج کا مزاج اس سے کافی دور چلا گیا ہے۔ بڑے بڑے اہل دانش و بینش اور صاحب علم و فضل کہتے ہیں ''اجی جماعت کی کیا ضرورت ہے؟ کام تو ہم بھی کر ہی رہے ہیں' نماز روزہ تو ہو ہی رہا ہے' کسی کی کوئی خدمت بھی کر دی جاتی ہے۔'' اگر واقعی کوئی کام کرنا ہے' اگر اسوۂ محمدیؐ پیش نظر ہے اور انقلابِ محمدیؐ کو دنیا میں دوبارہ لانے کی سعی و جہد کرنی ہے تب تنظیم سے رستگاری نہیں ہو سکتی' تنظیم کے بغیر کچھ نہیں ہو سکے گا۔ آج کے دور کا سب سے کٹھن کام یہی ہے ـــــ دیکھئے قرآن مجید (سورۂ مریم) میں عرب کے لوگوں کو قَوْمًا لُّدًّا کہا گیا ہے کہ یہ بڑی جھگڑالو قوم ہے۔ ہر ایک اپنی جگہ پر فرعونِ بے ساماں ہے' کون کسی کی سنے گا! کون کسی کے سامنے سر جھکائے گا! آج کا دور بھی ایسا ہی دور ہے کہ سب سقراط و بقراط ہیں' کون کسی کی سنے گا! لوگوں کے اپنے اپنے نظریات اور خیالات ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ چنانچہ اس دور میں کسی نظم کا پابند ہونا سب سے کٹھن کام ہے۔ کسی کی بات مانی جائے' کسی کا حکم مانا جائے' خود کو کسی ڈسپلن میں دے دیا جائے' سمع و طاعت کا نظم قبول کیا جائے' یہ بڑا مشکل اور کٹھن کام ہے۔ میرے نزدیک حضرت ابوبکر صدیقؓ کی قربانیوں میں سب سے بڑا ایثار یہی تھا کہ انہوں نے اپنی شخصیت کی کامل نفی کر کے اس کو نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس میں گم کر دیا تھا ـــــ حالانکہ بہت سے دُنیوی اعتبارات سے آپؓ نبی اکرم ﷺ سے آگے تھے۔ حضور ﷺ کے پاس اپنا ذاتی سرمایہ کوئی نہیں تھا۔ ازروئے الفاظ قرآنی: ﴿وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَاَغْنٰی﴾ ''اور تمہیں نادار پایا اور پھر مالدار کر دیا''۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو جب غنی کیا ہے تو سرمایہ اہلیہ محترمہ کا تھا۔ نقل کفر کفر نہ باشد' طائف والوں نے یہی طعنے تو دیئے تھے کہ اللہ کو ایک مفلس و قلاش کے سوا اپنا نبی بنانے کے لئے کوئی اور نہیں ملا تھا؟ مکہ والے بھی کہا کرتے تھے کہ اللہ کو نبی بنانا تھا تو دو عظیم شہروں (مکہ اور طائف) میں سے کسی صاحبِ ثروت سردار کو بناتا۔ حضور ﷺ کے پاس قریش کے اس قبائلی نظام کا کوئی منصب نہیں تھا' جبکہ ابوبکر صدیقؓ کے پاس سب سے زیادہ نازک اور حساس ذمہ داری تھی ـــــ یعنی دیت کا فیصلہ کرنا۔ آپؓ کے اختیار میں تھا کہ کسی مقتول کا کتنا خون بہا دیا جائے گا ـــــ گویا اس معاشرے میں کسی کی معاشرتی حیثیت (Social Status) کے تعین کرنے کا کام آپ کے سپرد تھا۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیں کہ اس معاشرے کے قبائلی نظام میں حضرت ابوبکرؓ کو کیا مقام حاصل تھا! لیکن انہوں نے اپنی شخصیت کی ایسی نفی کی ہے اور اپنے آپ کو محمد رسول اللہ ﷺ کی شخصیت میں اس طرح گم کیا ہے کہ ''ابوبکر'' تو نظر ہی نہیں آتے۔ نظر تو وہ آیا کرتا ہے جو اختلاف کرتا ہے۔ ایسے شخص کی شخصیت علیحدہ اور جدا نظر آئے گی جو کسی درجے میں اپنی بات کرتا ہو۔ لیکن جس کی اپنی کوئی بات ہی نہیں ہے' جو خود کو گم کر چکا ہو محمد رسول اللہ ﷺ کی شخصیت میں' وہ کہاں نظر آئے گا! ـــــ یہ ہے حضرتِ ابوبکرؓ کا سب سے بڑا ایثار اور سب سے بڑی قربانی۔

آج جو سب سے بڑا خناس ہمارے دماغوں میں بیٹھا ہوا ہے وہ یہی انانیت ہے۔ کوئی نظم ہوگا اور کوئی تنظیم ہوگی تو بہرحال اس کے امیر اور اس کے نظام العمل کی پابندی بھی کرنی ہوگی ـــــ لہٰذا اپنے آپ کو اس ''کھکھیڑ'' سے بچانے کے لئے یہ فلسفہ تراش لیا جاتا ہے کہ اجی کسی جماعت یا تنظیم کی ضرورت ہی کیا ہے؟ دین کا کام کسی نہ

کسی درجے میں ہم بھی کر ہی رہے ہیں ـــــ جماعتیں اور تنظیمیں تو عموماً فتنہ بن جایا کرتی ہیں ـــــ اس لئے اس سے حذر ہی بہتر ہے۔ ان حیلوں سے دل کو مطمئن کر لیا جاتا ہے۔ لوگ سڑک پر چلتے ہوئے حادثے کا شکار ہو جاتے ہیں، لیکن اس کے باوجود باہر نکلنا ترک نہیں کرتے۔ دل میں اصل چور یہی ہے کہ میں کیوں کسی کی مانوں؟ لیکن یہ جان لیجئے کہ تنظیم و جماعت کے بغیر دنیا میں کبھی کوئی کام نہیں ہو سکتا۔

تنظیم نبویؐ کی نوعیت

اب رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی روشنی میں مجھے تنظیم و ہجرت کے بارے میں کچھ عرض کرنا ہے ـــــ نبی اکرم ﷺ کی تنظیمیں دو نوعیتوں کی تھیں۔ ایک تنظیم کی نوعیت تو یہ تھی کہ، آپ ﷺ کے بر بنائے نبی و رسول ہونے کے، جو شخص آپؐ پر ایمان لے آیا، اس نے کلمۂ شہادت پڑھ لیا، تو وہ خود بخود بحیثیت مؤمن آپ کا مطیع و فرماں بردار ہو گیا اور آپ سے آپ اس بڑی تنظیم میں شامل ہو گیا جس کو اُمتِ مسلمہ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اب کسی دوسری تنظیم کی حاجت ہی نہیں۔ وہ حضور ﷺ کے احکام کا پابند ہے۔ آپ ﷺ کی اطاعت سے سرمو انحراف کرے گا تو اس کا ایمان ہی سلامت نہیں رہے گا۔ اس سے زیادہ مضبوط تنظیم کا دنیا میں وجود ممکن ہی نہیں ہے۔ دنیا میں ہر شخص کی رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، لیکن رسول اللہ ﷺ سے تو اختلاف ممکن نہیں۔ اختلاف کیا تو ایمان کی خیر نہیں ـــــ اختلاف کرنا تو دور رہا، بات مان بھی لی لیکن اگر دل میں کوئی اضطراب یا تنگی رہ گئی تو بھی ایمان کی خیر نہیں۔ از روئے الفاظ قرآنی:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾ (النساء:٦٥)

”نہیں (اے محمد ﷺ!) آپؐ کے ربّ کی قسم یہ ہرگز مؤمن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں آپؐ کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ آپؐ فیصلہ کریں اس پر اپنے دل میں کوئی تنگی بھی محسوس نہ کریں بلکہ سر بسر تسلیم کر لیں۔“

آپ نے دیکھا کہ آنجناب ﷺ کے حکم کو تسلیم نہ کرنے پر ہی نہیں بلکہ آپ کے فیصلوں کو خوش دلی سے قبول نہ کرنے پر بھی ایمان کی نفی کی جا رہی ہے اور اللہ تبارک و تعالیٰ اپنی ذات کی قسم کھا کر نفی فرما رہے ہیں ـــــ پھر دیکھئے سورۃ الحجرات میں فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ﴾ (آیت ۲)

”اے اہل ایمان! مت بلند کرو اپنی آوازوں کو نبیؐ کی آواز پر اور نہ ہی ان سے اونچی آواز میں بات کرو جس طرح تم باہم ایک دوسرے سے گفتگو کرتے ہوئے بلند آوازی اختیار کرتے ہو، مبادا تمہارے سارے اعمال برباد ہو جائیں (تمہاری ساری نیکیاں اکارت جائیں، تمہارے اب تک کئے کرائے پر پانی پھر جائے) اور تمہیں شعور و احساس تک نہ ہو“۔

شعور و احساس تو تب ہوتا ہے جب انسان یہ سمجھے کہ وہ نبی اکرم ﷺ کی کسی نافرمانی کا ارتکاب کر رہا ہے ـــــ غور کیجئے کہ یہاں نافرمانی، حکم عدولی اور معصیتِ رسولؐ کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوا، بلکہ مجرد سوئے ادب کی وجہ سے سارے اعمال کے حبط ہونے کی وعید سنائی جا رہی ہے۔

آگے چلئے اور دیکھئے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اطاعتِ رسول کے لئے کتنا محکم اور غیر مبہم ضابطہ و قانون بیان فرما دیا ہے: ﴿مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ﴾ (النساء:۸۰) ”جس نے رسولؐ کی اطاعت کی پس اس نے اللہ کی اطاعت کی۔“ ـــــ اسی ضمن میں خود نبی اکرم ﷺ کا قول بھی سن لیجئے: ((لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُونَ هَوَاهُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِهٖ)) ”تم میں سے کوئی شخص مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک اُس کی خواہش نفس اس ہدایت کے تابع نہ ہو جائے جو میں لے کر آیا ہوں“۔

قرآن و حدیث کی یہ تعلیمات و ہدایات پیش نظر رکھئے اور غور کیجئے کہ اس سے زیادہ مضبوط کسی اور تنظیم کا آپ تصور کر سکتے ہیں؟

مسنون ہیئت تنظیمی ـــــ بیعت سمع وطاعت

واقعہ یہ ہے کہ میں نے اس مسئلہ پر کافی طویل عرصے تک بہت غور کیا ہے اور آپ کو بھی غور وفکر کی دعوت دیتا ہوں کہ آنحضور ﷺ نے مختلف مواقع اور اوقات میں صحابہ ؓ سے جو بیعتیں لی ہیں' ان کی کیا ضرورت تھی؟ نبی اکرم ﷺ تو اپنی ذات میں خود مطاع ہیں' پھر بیعت کی ضرورت کیا ہے؟ غزوۂ بدر سے پہلے جو مشاورت ہوئی ہے کہ آیا قافلے کا رُخ کیا جائے جس میں صرف پچاس نفوس ہیں یا اُس لشکر کا جو پوری طرح کیل کانٹے سے لیس اور ایک ہزار جنگجوؤں پر مشتمل ہے' تو اسی موقع پر ہی تو حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے' جو قبیلہ خزرج کے سرداروں میں سے تھے' یہ بات کہی تھی کہ: اِنَّا آمَنَّا بِکَ وَصَدَّقْنَاکَ یعنی حضور! ہم آپ ؐ پر ایمان لا چکے' آپ ؐ کی بحیثیت رسول اللہ تصدیق کر چکے' اب کوئی Option ہمارے لئے کہاں رہ گیا ہے؟ــــ انہوں نے مزید عرض کیا کہ آپ ہمیں ساحل کے کنارے کھڑے ہو کر سمندر میں چھلانگ لگانے کا حکم دیجئے' ہم تعمیل کریں گے ــــ آپ ہمیں برک الغماد تک (جو یمن کا ایک دور دراز علاقہ ہے) چلنے کا حکم دیجئے' ہم چلیں گے' چاہے ہماری اونٹنیاں لاغر ہو جائیں ــــ لیکن اس کے باوجود مختلف مراحل پر آپ ؐ نے بیعتیں کیوں لیں؟ ــــ اس سوال کے جواب کو اس وضاحت سے سمجھئے جو میں پہلے پیش کر چکا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس پر قادر تھا کہ عرب میں انقلاب بھی آ جاتا اور اپنے محبوب ﷺ کے پائے مبارک میں ایک کانٹا بھی نہ چبھتا۔ اللہ نے ایسا نہیں کیا ــــ کیوں نہیں کیا؟ اس لئے نہیں کیا کہ نبی اکرم ﷺ کی اسلامی انقلاب کی انسانی سطح پر جدوجہد ہمارے لئے نمونہ بنے۔ اسی طرح صحابہ کرام ؓ سے حضور ﷺ کو کسی بھی موقع پر بیعت لینے کی کوئی ضرورت نہیں تھی ــــ لیکن بایں ہمہ آپ ؐ نے بیعتیں لیں تاکہ اُمت کو معلوم ہو جائے کہ اسلامی نظم جماعت کی بنیاد بیعت ہے۔

حدیبیہ کے موقع پر جب حضرت عثمان ؓ کی شہادت کی خبر پہنچتی ہے تو نبی اکرم ﷺ صحابہ کرام ؓ کو دعوت دیتے ہیں کہ کون عثمان ؓ کے خون کا قصاص لینے کے لئے میرے ہاتھ پر سرفروشی کی بیعت کرتا ہے! اس پکار پر چودہ سو جان نثار صحابہ کرام ؓ لبیک کہتے ہیں۔ وہ تو حضرت عثمان ؓ کی شہادت کی خبر ہی غلط نکلی ورنہ صحابہ کرام ؓ نے تو جان فروشی کے لئے خود کو پیش کر ہی دیا تھا۔ اسی بیعت کا نام ''بیعت رضوان'' ہے' جس کا ذکر سورۃ الفتح میں بڑے مہتم بالشان طریقے سے دو جگہ آیا ہے۔ آیت نمبر ۱۰ میں فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ یُبَایِعُوۡنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوۡنَ اللّٰہَ ؕ یَدُ اللّٰہِ فَوۡقَ اَیۡدِیۡہِمۡ ۚ﴾

''(اے نبی ؐ!) جو لوگ آپ سے بیعت کر رہے تھے' وہ دراصل اللہ سے بیعت کر رہے تھے' ان کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ تھا''۔

آگے آیت نمبر ۱۸ میں ان بیعت کرنے والوں کو بایں الفاظ بشارت دی جاتی ہے:

﴿لَقَدۡ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اِذۡ یُبَایِعُوۡنَکَ تَحۡتَ الشَّجَرَۃِ فَعَلِمَ مَا فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ فَاَنۡزَلَ السَّکِیۡنَۃَ عَلَیۡہِمۡ وَاَثَابَہُمۡ فَتۡحًا قَرِیۡبًا ﴿۱۸﴾﴾

''اللہ ان مؤمنوں سے راضی ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے (اے نبی!) آپ سے بیعت کر رہے تھے۔ اللہ کو ان کے دلوں کا حال معلوم تھا۔ اسی لئے اس نے ان پر سکینت نازل فرمائی اور ان کو قریبی فتح بخشی''۔

بیعت عقبہ ثانیہ ہو رہی ہے کہ آپ سے عرض کیا جاتا ہے کہ حضور آپ مدینہ تشریف لے آیئے' ہم آپ کی اس طرح حفاظت کریں گے جیسے اپنے بال بچوں کی کرتے ہیں۔ بیعت کرنے والے وہ ہیں جو پہلے ہی سے ایمان لا چکے ہیں ــــ قول و قرار کے لئے بیعت ہو رہی ہے ــــ معاہدے ہو رہے ہیں۔ احادیث میں مختلف بیعتوں کا ذکر ہے۔ میں یہاں صرف ایک حدیث بیان کر رہا ہوں جس کے راوی حضرت عبداللہ بن عمر ؓ ہیں اور جسے امام بخاری ؒ اور امام مسلم ؒ اپنی اپنی ''صحیح'' میں لائے ہیں۔ گویا یہ حدیث متفق علیہ ہے جو حدیث کا سب سے بلند مقام و مرتبہ ہے۔ حدیث کے الفاظ ہیں:

عَنِ ابۡنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡھُمَا قَالَ : کُنَّا اِذَا بَایَعۡنَا رَسُوۡلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ عَلَی السَّمۡعِ وَالطَّاعَۃِ یَقُوۡلُ لَنَا : ((فِیۡمَا اسۡتَطَعۡتُمۡ))

''ابن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ ہم جب رسول اللہ ﷺ سے سمع و طاعت کی بیعت کرتے تو آپ ؐ فرماتے کہ ''جس چیز کی تم طاقت رکھو۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ صحابہ کرام ؓ سے مختلف اوقات میں مختلف کاموں کے لئے بیعت لیا کرتے تھے۔

بیعت کا یہ نظام جو ہمیں تعلیم دیا گیا ہے یہ درحقیقت اس تنظیم کی اساس و بنیاد ہے کہ جو اس کام کو کرنے کے لئے منظّم ہو جو نبی اکرم ﷺ اُمت کے حوالے کر گئے ہیں۔ یعنی عالمی سطح پر انقلابِ محمدی ؐ کا بول بالا کرنا۔ اس کام کے لئے طریق تنظیم یہ بیعت کا نظام ہے۔ کوئی اللہ کا بندہ جب آگے آئے اور پکارے کہ ''مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ'' تو آپ اس کے ہاتھ میں ہاتھ دیں اور سمع و طاعت کی بیعت کریں۔ فرق یہ ہوگا کہ نبی اکرم ﷺ سے جو بیعت کی جاتی تھی، وہ مطلق ہوتی تھی کہ جو حکم آپ ؐ دیں گے وہ واجب الاطاعت ہوگا۔ اس لئے کہ ع گفتۂ او گفتۂ اللہ بود۔ ان کا فرمان اللہ کا فرمایا ہوا تھا۔ اور ﴿مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ﴾ ''جس نے رسول ؐ کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی''۔ اب جو بیعت ہوگی، وہ مشروط ہوگی۔ یہ اطاعت ''فی المعروف'' کی شرط کے ساتھ مشروط ہوگی۔ پس نبی اکرم ﷺ کا تیسرا اسوہ ہے کسی تنظیم کے قیام کے لئے نظامِ بیعت۔

احیائے دین اور اقامت دین کی جدوجہد کے لئے دستوری تنظیموں اور الیکشنوں کے ذریعے قائم ہونے والی تنظیموں اور امیر اور شوریٰ یا انتظامیہ کے لئے دو سال یا پانچ سال کے بعد الیکشن اور ان کے درمیان فرائض و اختیارات اور حقوق کا توازن قائم کرنے کے طریقہ کار کو میں کفر یا قطعی طور پر خلافِ اسلام نہیں کہتا، لیکن پورے شرحِ صدر کے ساتھ یہ ضرور کہتا ہوں کہ یہ طریقِ تنظیم اسوۂ رسول کے مطابق نہیں ہے۔ میں پھر عرض کر رہا ہوں کہ نبی اکرم ﷺ کو تو بیعت لینے کی احتیاج ہی نہ تھی۔ حضور ؐ نے مختلف اوقات میں جو بیعتیں لیں وہ میرے نزدیک اس لئے تھیں کہ آئندہ کے لئے ہمیں روشنی ملے اور حضور ﷺ کا طرزِ عمل ہمارے لئے اُسوہ بنے۔ لہٰذا حضرت ابو بکر ؓ کی خلافت کا نصب ہو رہا ہے تو بیعت کی بنیاد پر۔ حضرت عمر فاروق ؓ کا ہو رہا ہے تو بیعت سے۔ حضرت عثمان غنی ؓ کا ہو رہا ہے تو بیعت پر۔ حضرت علی ؓ کا نصبِ خلافت بھی بیعت کی بنیاد پر ہوا ہے۔ اس کے بعد بیعتیں تقسیم ہو گئیں۔ یہاں تک تو بیعت ایک تھی۔ وہ دینی بیعت بھی، سیاسی بیعت بھی اور انتظامی بیعت بھی تھی، لیکن خلافت راشدہ کے بعد یہ وحدت ختم ہو گئی۔ اس دور میں نظامِ حکومت کا عنوان تو خلافت ہی رہا لیکن اصلاً وہ ملوکیت میں تبدیل ہو گیا اور خلفاء تقویٰ کے لحاظ سے اس معیارِ مطلوب کے مطابق نہ رہے جو خلفائے راشدین میں نظر آتا تھا، لہٰذا بیعت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ چنانچہ ایک سیاسی بیعت یعنی خلیفہ وقت کی اطاعت کے لئے ہوتی تھی جو بتدریج ایک معروف کا درجہ حاصل کر گئی جو دورِ بنی اُمیہ، بنو عباس اور دورِ عثمانیہ تک ہمیں کسی نہ کسی صورت میں نظر آتی ہے ـــــ اور دوسری بیعت ''بیعت ارشاد'' کسی بزرگ، خدا ترس، متقی، متدین، مزکی و مربی اور مرشد کے ہاتھ پر ہونے لگی۔ پھر اس بیعت ارشاد کے بھی کئی سلاسل وجود میں آ گئے۔ جیسے فقہی مسائل میں چار مسالک فقہ مشہور ہوئے اسی طرح انفرادی رشد و ہدایت اور تزکیہ و تربیت نفس کے لئے بھی چار سلاسل مشہور ہیں۔

اس بات کو بھی سمجھ لیجئے کہ یہ دو بیعتیں اُس وقت تک رائج رہیں جب تک شریعت اور قانونِ اسلام کا ڈھانچہ قائم (intact) رہا۔ تا آنکہ وہ دور شروع ہوا جب ایک طرف وحدتِ ملی پارہ پارہ ہوئی اور دوسری طرف متعدد مسلم ممالک براہ راست سیاسی طور پر مغربی استعمار کے استیلاء کے پنجے میں گرفتار ہو کر سیاسی طور پر غلامی سے دوچار ہوئے اور ہمارے دین کا برائے نام ڈھانچہ بھی برقرار نہ رہا اور پوری عمارت زمین بوس ہو گئی۔ شریعت اور اسلامی قانون مختلف ممالک میں مختلف ادوار میں منسوخ کر دیا گیا اور قاضیوں کی عدالتیں برطرف کر دی گئیں۔ ان حالات میں تجدید و احیائے دین کی تحریکیں اور تنظیمیں ابھرنے لگیں ـــــ اور پھر ہمیں نظر آتا ہے کہ یہ دونوں بیعتیں یکجا جمع ہو گئیں۔ سوڈان میں مہدی سوڈانی ابھرے۔ طرابلس (موجودہ لیبیا) میں سنوسی تحریک اور نجد میں محمد بن عبدالوہاب ؒ کی تحریک اٹھی (جو وہابی تحریک کے نام سے مشہور

ہے)۔ یہ تمام تحریکیں بیعت کے نظام پر سمع و طاعت اور ہجرت و جہاد کے لئے بپا
ہوئیں۔اس طرح ہمیں ان تحریکوں میں اس سنتِ بیعت کی تجدید نظر آتی ہے۔

سید احمد بریلویؒ کی تحریک میں عجب شان نظر آتی ہے۔ وہ مسلک کے اعتبار سے
حنفی ہیں، مستند عالمِ دین بھی نہیں، لیکن ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے والوں میں امام
الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے خانوادے کے چشم و چراغ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ بھی شامل ہیں،
جو اہل حدیث ہیں۔ آج برعظیم پاک و ہند میں جو اہل حدیثیت ہمیں نظر آتی ہے وہ گُل
کی گُل ان ہی کی مساعی کا ظہور ہے۔لیکن وہ بیعت جہاد ایک حنفی کے ہاتھ پر کر رہے
ہیں۔سید صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے پہلے بیعت ارشاد لی، پھر بیعتِ جہاد لی۔اس طرح
ایک ہی شخصیت میں دونوں بیعتیں جمع ہو گئیں۔یہ تو بیسویں صدی میں مغرب کے سیاسی
استیلاء کے ساتھ ذہنی مرعوبیت کے پیشِ نظر دستوری اور قانونی تنظیمیں قائم ہونی شروع
ہو گئیں، ورنہ اس سے قبل اس قسم کی کسی تنظیم اور جماعت کی تشکیل کا کوئی سراغ ہمیں اپنی
تاریخ میں نہیں ملتا۔صحابہؓ و تابعین کے دور میں صدارتی نظام کہیں نظر نہیں آتا کہ اتنے
سال کے بعد صدر ہٹ جائے اور پھر دوبارہ انتخاب ہو۔ وہاں تو یہ نظر آتا ہے کہ جس
کے ہاتھ پر بیعت ہوتی تھی وہ تاحینِ حیات ہوتی تھی۔ آپ کو ایک مقصد پورا کرنا ہے،
جب امیر وہ مقصد پورا کر رہا ہے تو آخر کس دلیل سے آپ اس کو الیکشن کے ذریعے بدلنا
چاہیں گے؟ ہاں اگر وہ مقصد سے ہٹ گیا ہے تو آپ اپنا راستہ علیحدہ کر لیں، بیعت فسخ
کریں اور اپنے طور پر کام شروع کریں۔کوئی اور ایسا نظر آئے جس پر اطمینان ہو کہ وہ
بہتر کام کر رہا ہے تو اس کے ہاتھ پر بیعت کر لیں۔حاصل بحث یہ ہے کہ تجدید و احیائے
دین کے لئے کام کرنے کا جو طریقہ سنت نبویؐ اور تعامل سلف صالحین سے ثابت ہے وہ
بیعت کا نظام ہے۔اس کے علاوہ جو طریقے اختیار کئے جاتے ہیں، وہ اسوۂ رسول اور
سنت سے ہٹے ہوئے ہیں۔

یہ باتیں کہتے ہوئے دل روتا ہے کہ اس وقت ہمارا حال یہ ہے کہ جس طرح
ہمارے ہاں ''وعظ'' گالی بن گیا ہے جو قرآن کی اصطلاح ہے، اسی طرح ''بیعت'' کے
ساتھ، جو خالصتاً قرآن وسنت کی اصطلاح ہے، ذہن میں فوراً دکانداری کا تصور آتا
ہے۔ قبے، عمامے، جبے اور ایک خاص اندازِ نشست و برخاست اور ایک خاص اندازِ
گفتار کے ساتھ کسی شخصیت کا نقشہ ذہن میں اُبھرتا ہے، جن کے ساتھ مریدین کا ایک
حلقۂ خدام ادب کی حیثیت سے موجود ہوتا ہے۔اس کے سوا کچھ نہیں۔اگر بہت ہوگا تو
یہ کہ کچھ ذکر کے حلقے ہو جائیں گے۔اللہ اللہ خیر صلاّ ——— اس سے آگے ان کی کوئی
دعوت نہیں۔اس طرح ہم نے اس بیعت کو بھی بدنام کر کے رکھ دیا ہے ——— ہم نے کس
چیز کو بدنام نہیں کیا ہے؟ بقول اقبال ؎

یہی شیخِ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیمِ بوذرؓ و دلقِ اویسؒ و چادرِ زہراؓ

ہم نے ہر چیز بیچ کھائی ہے۔دکان دار ہم ہیں۔بدنام ہم نے دین کو کیا ہے ——— حج اور
عمرے کے مواقع پر اسمگلنگ ہم کرتے ہیں لیکن بدنام حج ہوتا ہے۔صوم وصلوٰۃ کے
ساتھ سودی لین دین، بلیک مارکیٹنگ، ذخیرہ اندوزی، ملاوٹ اور بہت سی بدمعاملگیاں
ہم کرتے ہیں اور بدنام دین ہوتا ہے ——— لیکن بایں ہمہ اگر ہم چاہتے ہیں اسوۂ رسول
کی پیروی کریں تو بیعت خواہ کتنی ہی بدنام ہو چکی ہو ہمیں تو اسی پر چلنا ہے۔اگر وعظ
گالی بن گیا ہے تو بنا کرے، ہمارے لئے تو قرآن ہی وعظ ہے۔ از روئے الفاظ
قرآنی: ﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدۡ جَآءَتۡكُمۡ مَّوۡعِظَةٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی
الصُّدُوۡرِ وَهُدًی وَّرَحۡمَةٌ لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ﴾ ——— لٹریچروں سے دعوتیں چلتی ہوں تو چلا
کریں، ہمارا لٹریچر تو قرآن ہے۔اسی کو پڑھو اور پڑھاؤ۔اسی کو سمجھو اور سمجھاؤ۔اسی کی
شرح و وضاحت کرو، تحریر سے بھی، تقریر سے بھی۔ ہر ایک کی اساس قرآن ہو۔
بفحوائے ارشادِ ربانی: ﴿بَلِّغۡ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ﴾ اور بموجب فرمانِ نبوی:
((بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ آیَةً))

آپ حضرات بخوبی واقف ہیں کہ میں قرآن حکیم کا ادنیٰ طالب علم ہوں۔قرآن
مجید اور سیرتِ مطہرہ پر غور و فکر کے نتیجے میں جو بات مجھ پر منکشف ہوئی ہے اس پر الحمدللہ

عمل بھی شروع کر دیا ہے۔ وہ یہ کہ اقامتِ دین کی جدوجہد کوئی اضافی نیکی نہیں بلکہ میرا اور ہر مسلمان کا فرضِ عین ہے ـــــ اس کے لئے تنظیم کا قیام لازم ہے اور اس تنظیم کی ہیئت تشکیلی بیعت کے نظام پر ہونی عین سنت کا تقاضا ہے۔ میں اگر محض درسِ قرآن ہی دیتا رہتا اور سیرتِ مطہرہ کا بیان ہی کرتا رہتا لیکن قرآن حکیم اور سیرتِ مبارکہ سے جو پیغام اور تعلیم مجھے ملتی، اس پر عمل پیرا ہونے کی کوشش نہ کرتا تو مجھ سے بڑا ڈھوکے باز کوئی اور نہ ہوتا۔ میں درسِ قرآن، سیرتِ مطہرہ کے بیان اور وعظ کہنے کی حیثیت سے بہت مشہور (Popular) ہو گیا ہوں۔ تحدیثِ نعمت کے طور پر عرض کر رہا ہوں کہ میرے درسِ قرآن کو پاکستان ہی میں نہیں بہت سے بیرونی ممالک میں بھی انتہائی قبولِ عام حاصل ہوا ہے۔ میں یہی کام کرتا رہتا اور کبھی عمل کی دعوت نہ دیتا تو میرا خیال ہے کہ اس وقت اگر یہاں چار پانچ سو کی حاضری ہے تو ایسی صورت میں یہ حاضری ہزاروں سے متجاوز ہوتی۔ اس لئے کہ ہمارے ہاں صرف ''سننے'' کا انتہائی ذوق وشوق ہے۔ ہم سُنّی ہیں اور خالص ''سُنّی'' ہیں۔ یہ جو بار بار عمل کی دعوت دی جاتی ہے اور غلط کاموں پر جو ڈانٹ پڑتی ہے، اسے آدمی ایک دفعہ سن لے گا، دو مرتبہ سن لے گا، بار بار کون سننے آئے گا؟ میرے چند قریبی واقف کار میرے پیچھے جمعہ پڑھنا چھوڑ گئے۔ انہوں نے مجھ سے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا کہ تمہاری تقریر بہت سخت ہوتی ہے۔ تم کاروبار میں سود کی آمیزش پر قرآن وحدیث کے حوالے سے تنقیدیں کرتے ہو اور وعیدیں سناتے ہو۔ تم متعدد غیر اسلامی معتقدات اور رسوم ورواج پر شدید گرفت اور نکیر کرتے ہو۔ ہم جس معاشرے میں رہ رہے ہیں اور جن حالات سے گزر رہے ہیں، ان میں ان کا ترک کرنا ہمارے لئے مشکل ہی نہیں محال ہے۔ تمہاری تقریریں سن کر ہمارا ضمیر ملامت کر ہمیں سرزنش کرتا ہے۔ اس کشمکش سے بچنے کے لئے ہم نے تمہارے پیچھے جمعہ پڑھنا اور تمہارے درس میں شریک ہونا ہی چھوڑ دیا ہے۔ اگر مجھے صرف درسِ قرآن اور محض علمی نکات ہی کو بیان کرنا ہوتا تو موجودہ حاضری سے دس گنا زیادہ حاضری ہو سکتی تھی۔ لیکن میں قرآن کا عملی پیغام پیش کرتا ہوں، صرف علمی نکات پیش کرنا اور اس میدان میں موشگافیاں کرنا ذہنی عیاشی بن جائے گی۔ میرا قلب و ذہن مجھ سے پوچھتا ہے کہ اگر تم نے صرف یہی کچھ کیا تو اللہ کے ہاں کیا جواب دو گے؟ تم نے سب کچھ ہضم کر لیا ہے، اگر اس قرآن کو بھی ہضم کر گئے تو ﴿فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَهٗ یُؤْمِنُوْنَ ﴾ (المرسلٰت) ''پس اس کے بعد کون سی بات ہے جس پر تم ایمان لاؤ گے؟''

خلاصۂ بحث

یہ چند باتیں بطورِ جملہ ہائے معترضہ درمیان میں آ گئیں۔ اب خوب توجہ سے میری آج کی تقریر کا خلاصہ پھر سن لیجئے۔ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ میں نے اپنے فہم کی حد تک قرآن کا جو پیغام سمجھا ہے، وہی پیغام ہمیں احادیث میں ملتا ہے اور وہی پیغام ہمیں سیرتِ مطہرہ سے ملتا ہے ـــــ اسی بات کو میں نے آج اسوۂ حسنہ کے حوالے سے آپ کے سامنے رکھا ہے ـــــ اور وہ اُسوۂ حسنہ یہ ہے:

محمد رسول اللہ ﷺ کی دعوت ایمان باللہ، ایمان بالآخرۃ اور ایمان بالرسالت کسی تبلیغی، رفاہی، اصلاحی، علمی وتحقیقی اور سیاسی نوعیت کی نہیں تھی، بلکہ خالص انقلابی نوعیت کی دعوت تھی۔ یہ تمام کام اس میں بطور اجزاء شامل تھے۔ چنانچہ اس دعوت کے نتیجے میں جو انقلابِ عظیم دنیا میں برپا ہوا، اس سے پوری انسانی زندگی میں تبدیلی رونما ہوئی۔ عقائد ونظریات، سیرت وکردار، نظامِ حکومت وسیاست، علوم وفنون، قانون و اخلاق، تہذیب وتمدن اور معاشرت ومعیشت، الغرض حیاتِ انسانی کا کوئی گوشہ بھی بدلے بغیر نہ رہا۔

یہ انقلابی جدوجہد خالص انسانی سطح (Human Level) پر قدم بقدم چل کر کی گئی اور ایک انقلابی جدوجہد کو جن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے، وہ سب مراحل نبی اکرم ﷺ کی اس انقلابی دعوت کو بھی پیش آئے ـــــ اللہ کی نصرت وتائید بھی حاصل ہوئی لیکن اُس وقت جب نبی اکرم ﷺ اور آپ کے جان نثار صحابہ کرام ؓ نے اپنی امکانی حد تک اس جدوجہد میں مثالی قربانی اور ایثار پیش کیا۔

آپؐ کی جدوجہد جن مراحل سے گزری ان کو دو دو الفاظ کے جوڑوں کے ساتھ میں نے تین حصوں میں منقسم کر کے قدرے تفصیل کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔

☆ پہلا مرحلہ: دعوت و تربیت

☆ دوسرا مرحلہ: تنظیم و ہجرت

☆ تیسرا مرحلہ : جہاد و قتال

اس مختصر وقت میں، میں نے کوشش کی ہے کہ دعوت و تربیت اور تنظیم و ہجرت کے ضمن میں ضروری نکات آپ کے سامنے پیش کر دوں۔ دعوت و تربیت کے مرحلے کے متعلق میں نے آپ کے سامنے چند اہم نکات اسوۂ حسنہ کی روشنی میں بیان کر دیئے ہیں۔ دعوتِ ایمان قبول کرنے والوں کی تنظیم تو آپ سے آپ ہو جاتی تھی، کیونکہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی تصدیق اور آپ کو رسول اللہ تسلیم کرنے کا لازمی تقاضا تھا کہ تمام اہل ایمان، ایک تنظیم، ایک جماعت اور ایک اُمت بن جائیں اور اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی بے چون و چرا تسلیم و رضا کی کیفیات کے ساتھ پیروی کریں۔ پھر ہجرت تو تنظیم کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ کچھ اختیار کرو گے تو کچھ ترک بھی کرنا پڑے گا۔ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرنی ہے تو ہر اُس چیز کو چھوڑنا ہو گا جو اللہ اور اس کے رسول کو ناپسند ہے۔ کسی سے جڑو گے تو کسی سے کٹو گے بھی۔ سیدھی سیدھی بات ہے۔ دین پر عمل کرنے کے باعث آج اپنے دوست سے کٹے تو کل اپنے بھائی سے کٹو گے۔ ہوسکتا ہے کہ بیوی سے بھی کٹنا پڑ جائے۔ ہوسکتا ہے وہ وقت بھی آ جائے کہ ہر ایک چیز سے کٹنا پڑ جائے۔ تو جو لوگ اللہ اور اس کے رسول پر پختہ یقین رکھتے ہیں، وہ کٹ جایا کرتے ہیں۔ وہ گھر بار کو حتیٰ کہ وطن کو بھی چھوڑ کر ایسے نکل جاتے ہیں جیسے جانتے ہی نہیں تھے کہ یہ ہمارا وطن تھا۔ لیکن جو کسی اصول کی خاطر ایک دوست اور ایک بھائی سے نہ کٹ سکا وہ اللہ اور اس کے دین کے لئے اپنا وطن کیسے چھوڑ دے گا؟ جو ایک پیسے میں امین ثابت نہ ہو کیا وہ لاکھ روپے میں امین ثابت ہو گا؟ جو چھوٹا سا وعدہ پورا نہ کر سکے، وہ بڑے بڑے وعدے پورے کرے گا؟ یہ باتیں ناممکنات میں سے ہیں۔۔۔ ہجرت تنظیم کے ساتھ بطور ضمیمہ منسلک ہے۔

پھر جہاد ہے۔ ''جہاد'' دراصل اس جدوجہد کا نام ہے جس میں ایک بندۂ مؤمن باطن میں اپنے نفس سے اس کو اللہ اور رسول کا مطیع و فرمانبردار بنانے کے لئے کشمکش کرتا ہے، اور ظاہر میں دعوتِ حق کی تبلیغ کے لئے بھاگ دوڑ، سعی و کوشش اور اس کے قیام کے لئے محنت و مشقت بھی اسی جہاد میں شامل ہوتی ہے۔۔۔ پھر قتال ہے۔ جب بھی اس کا مرحلہ آ جائے تو ایک بندۂ مؤمن اس کے لئے تیار بھی رہے اور اس کی تمنا کی دل میں پرورش بھی کرتا رہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے: ''جس شخص نے نہ تو اللہ کے راستے میں جنگ کی اور نہ ہی اس کے دل میں اس کی تمنا پیدا ہوئی اس کی موت ایک نوع کے نفاق پر واقع ہوئی''۔

اہل ایمان سے مطلوب رویہ

سورۃ الاحزاب میں زیر درس آیت ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ کے بعد کی دو آیات یہ ہیں:

﴿وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ز وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ۞ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ج فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ز وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۞﴾ (آیات ۲۲،۲۳)

''اور سچے مؤمنوں کا حال یہ تھا کہ جب انہوں نے (غزوۂ احزاب کے موقع پر) حملہ آور لشکروں کو دیکھا تو پکار اُٹھے کہ یہ وہی چیز ہے جس کا اللہ اور اس کے رسولؐ نے ہم سے وعدہ کیا تھا[1] اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی بات سچی تھی۔ اس واقعہ نے ان کے ایمان اور سپردگی کو اور زیادہ بڑھا دیا۔ ایمان لانے والوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے اللہ سے کئے ہوئے وعدے کو سچ کر دکھایا ہے (یعنی وہ صبر و ثبات سے ڈٹے بھی رہے) اور ان میں سے کوئی اپنی نذر

---

(۱) اشارہ ہے سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۵۵ کی طرف۔

پوری کر چکا (یعنی اللہ کی راہ میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کر چکا) اور کوئی اپنی باری آنے کا منتظر ہے۔اور انہوں نے اپنے رویئے میں کوئی تبدیلی نہیں کی''۔

اس آیت میں ''وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّنۡتَظِرُ'' خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ایک مؤمن کے ایمان کا تقاضا ہے کہ وہ بڑے ذوق وشوق اور اشتیاق کے ساتھ اس بات کا منتظر رہے کہ کب وہ وقت آئے کہ وہ اللہ کی راہ میں گردن کٹا کر سرخرو ہو۔اس لئے کہ سورۃ التوبۃ کی آیت نمبر ۱۱۱ کی رو سے اہل ایمان اللہ سے سودا کر چکے ہیں اور جنت کے عوض اپنا مال اور اپنی جان اس کے ہاتھ بیچ چکے ہیں:

﴿اِنَّ اللّٰهَ اشۡتَرٰى مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اَنۡفُسَهُمۡ وَاَمۡوَالَهُمۡ بِاَنَّ لَهُمُ الۡجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوۡنَ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ فَيَقۡتُلُوۡنَ وَيُقۡتَلُوۡنَ ۚ وَعۡدًا عَلَيۡهِ حَقًّا فِى التَّوۡرٰٮةِ وَالۡاِنۡجِيۡلِ وَالۡقُرۡاٰنِ ؕ وَمَنۡ اَوۡفٰى بِعَهۡدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسۡتَبۡشِرُوۡا بِبَيۡعِكُمُ الَّذِىۡ بَايَعۡتُمۡ بِهٖ ؕ وَذٰلِكَ هُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِيۡمُ﴾ (التوبة:۱۱۱)

''یقیناً اللہ نے مؤمنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال جنت کے عوض خرید لئے ہیں۔وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں' پھر قتل کرتے ہیں اور قتل ہوتے ہیں۔اللہ کی طرف سے ان کے اس طرز عمل پر پختہ وعدہ ہے تورات میں بھی' انجیل میں بھی اور قرآن میں بھی۔اور کون ہے جو اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کو پورا کرنے والا ہو! پس خوشیاں مناؤ اپنے اس سودے پر جو تم نے اللہ کے ساتھ چکالیا ہے۔یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔''

آپ نے ملاحظہ کیا کہ اس آیت شریفہ میں لفظ ''بیع'' جس سے ''بیعت'' بنا ہے' پوری جامعیت کے ساتھ قول وقرار اور عہد و پیمان کے لئے استعمال ہوا ہے۔اس آیت کی رو سے مؤمنین تو اپنے مال اور اپنی جان اللہ کے ہاتھ بیچ چکے۔اب جب بھی یہ مرحلہ آئے تو وہ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر اللہ کی یہ امانت اسے لوٹانے کے لئے میدانِ کارزار میں نکلیں گے۔لیکن اس کے متعلق کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا کہ یہ مرحلہ کب آئے گا۔آگے کے مراحل کے بارے میں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔کچھ پتہ نہیں کہ کب کیا مرحلہ آجائے اور کیا صورت حال پیدا ہو جائے! یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک شخص دعوت دیتا رہے اور اسی میں اس کی زندگی تمام ہو جائے اور اس کو ایک ساتھی بھی نہ ملے۔نبیوں کے باب میں بھی ایسا ہوا ہے۔یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی جگہ تمکن عطا فرما دے۔اس کا دارومدار ہماری سوچ پر نہیں ہے۔جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں کہ نبی اکرمﷺ تو مکہ سے مایوس ہو کر طائف تشریف لے گئے تھے۔مدینہ کی کھڑکی تو اللہ نے خود کھولی۔مکہ میں اہل یثرب کے چھ اشخاص ایمان لے آئے۔اگلے سال بارہ آدمی آگئے اور اس سے اگلے سال ۷۵ آگئے اور بیعت عقبہ ثانیہ منعقد ہوئی۔پھر نبی اکرمﷺ کے قدم مبارک ابھی وہاں پہنچے بھی نہیں تھے کہ مدینہ کو دارالہجرت بننے کی سعادت حاصل ہوگئی اور وہاں حضورﷺ کی تشریف آوری کا بڑے اشتیاق کے ساتھ انتظار ہونے لگا اور استقبال کی تیاریاں ہونے لگیں۔جبکہ مکہ جہاں حضورﷺ بہ نفس نفیس تیرہ برس سے دعوت دے رہے ہیں' وہ خون کا پیاسا بنا ہوا ہے۔کون سے حساب کتاب میں یہ چیز آتی ہے؟ یہ مشیت الٰہی ہے۔آگے کے مراحل کے بارے میں کوئی لال بجھکڑ بن کر کہے کہ یوں ہوگا تو اس کی بات درخورِ اعتناء نہیں ہوگی۔ہم اُسوۂ رسولﷺ کے راستے پر چلنے کی کوشش کریں گے۔اگر اخلاص ہمارے شامل حال رہا تو اس راہ میں پوری زندگی کھپا کر یا سر کٹا کر دُنیوی اعتبار سے ناکام ہو جانا بھی ہمارے لئے کامیابی ہے' اور کامیاب ہوگئے تو پھر تو کامیاب ہیں ہی۔اسی کو قرآن ''اِحۡدَى الۡحُسۡنَيَيۡنِ'' سے تعبیر کرتا ہے۔اس راہ میں آخرت کے اعتبار سے ناکامی کا کوئی سوال ہی نہیں۔بالاکوٹ کے میدان میں راہ حق میں سر کٹانے والے کیا ناکام ہوئے؟ ہرگز نہیں! ان کی کامیابی پر تو فرشتے رشک کرتے ہوں گے۔وہ تو شہادت کے مرتبے پر فائز ہیں' جو انبیاء اور صدیقین کے بعد آخرت میں سب سے اعلیٰ مقام ہے۔

ہم نے اسوۂ رسولﷺ کی روشنی میں ''تنظیم اسلامی'' سمع وطاعت کی بیعت کی بنیاد پر بنائی ہے۔اگرچہ ہم بہت کچے ہیں' تعداد کے لحاظ سے بھی قافلہ بہت ہی چھوٹا ہے اور اب تک جو ساتھی ملے ہیں وہ معیارِ مطلوب سے بہت نیچے ہیں۔لیکن میں اس پر بھی اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں۔اس معاشرے میں سے مجھے جو ساتھی ملے ہیں وہ بھی

غنیمت ہیں۔ میں اللہ کے ہاں اپنا جواب تیار کر رہا ہوں کہ اے میرے ربّ! میں نے کچھ اور نہیں کیا۔ مجھے تو نے جو صلاحیت' طاقت' توانائی اور استعداد عطا فرمائی تھی میں نے اسے تیری کتاب مبین کے پیغام اور اسوۂ رسول ﷺ کی طرف دعوت دینے میں لگایا اور کھپایا ہے۔ میں نے مداہنت نہیں کی ع میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند! میں نے کبھی اس کی پرواہ نہیں کی کہ یہ کہوں گا تو اہل حدیث ناراض ہو جائیں گے اور وہ کہوں گا تو احناف مجھ سے خفا ہو جائیں گے یا لوگ میرے دروس و خطابات میں آنا چھوڑ دیں گے۔ میں نے جس بات کو قرآن وسنت کے مطابق حق سمجھا ہے اسے ڈنکے کی چوٹ کہا ہے' برملا کہا ہے' بغیر خوف لَوْمَةَ لَائِم کہا ہے' صرف اللہ کے خوف اور اس بات کو پیش نظر رکھنے کی شعوری کوشش کرتے ہوئے کہا ہے کہ: ﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ۞﴾ (ق:۱۸) ''کوئی لفظ اس کی زبان سے نہیں نکلتا جسے محفوظ کرنے کے لئے ایک حاضر باش نگران نہ ہو''۔ اور آج میں نے اسوۂ رسولؐ کے حوالے سے اپنی استعداد کی حد تک ساری بات آپ کے سامنے رکھ دی ہے۔ اب آپ سوچئے کہ آپ کس مقام پر کھڑے ہیں؟ فیصلہ آپ کا ہے۔ ذمہ داری آپ کی ہے۔ جواب دہی آپ کو کرنی ہے۔ بات پوری سامنے آ چکی ہے۔ لیکن اگر کوئی تنظیم اسلامی کی دعوت کو مزید سمجھنا چاہتا ہو تو میں اس کو دعوت دوں گا کہ وہ تنظیم کے کتابچوں کا مطالعہ کر لے' پھر فیصلہ کرے۔ میں آپ کو یہ حدیث نبویؐ سنا چکا ہوں کہ: ((اَنَا آمُرُكُمْ بِخَمْسٍ : بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ)) ''میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں: جماعت کا اور سمع وطاعت کا اور اللہ کی راہ میں ہجرت اور جہاد کا'' ——— چنانچہ جماعت کے بغیر زندگی بسر کرنا خلافِ سنت زندگی ہے۔ کوئی اپنی جگہ بڑے سے بڑا سنت کا پرچارک بنا ہوا ہو اور خود کو متبع سنت سمجھتا ہو' اگر وہ نظم جماعت کے بغیر زندگی بسر کر رہا ہے تو اس کی پوری زندگی خلافِ سنت ہے۔ اسی لئے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا تھا کہ لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِجَمَاعَةٍ. رضائے الٰہی اور اسوۂ رسول کی پیروی کے لئے جب تک اپنے آپ کو ایسی جماعت کے حوالے نہ کر دیا جائے جو اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے قائم ہو' زندگی بحیثیت مجموعی سنت کے مطابق نہیں ہو گی اور بات وہی ہو گی جو حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمائی تھی کہ مچھر چھانے جائیں گے اور سموچے اونٹ نگلے جائیں گے۔

اسوۂ رسول ﷺ سے میں نے دین کے انقلابی پیغام کے لئے دعوت و تربیت' تنظیم و ہجرت اور جہاد وقتال کے مراحل اور اس کام کے لئے ایک ''تنظیم'' کی ضرورت کے دلائل آپ کے سامنے رکھ دیئے ہیں۔ یہ بات قرآن حکیم سے سمجھنا چاہیں تو تھوڑے سے غور و تدبر کے بعد اِن شاء اللہ سُورۂ آل عمران کی یہ آیت مبارکہ تنظیم کی دعوت کو سمجھنے کے لئے کفایت کرے گی:

﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۞﴾ (آیت ۱۰۴)

''تم میں سے ایک جماعت تو ایسی ضرور ہونی چاہئے جو نیکی کی طرف بلائے' بھلائی کا حکم دے اور برائیوں سے روکتی رہے۔ یہی لوگ فلاح پانے والے ہوں گے۔''

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ